انجمن ترقی پسند مصنفین کا ماہنامہ

نئی دُنیا کو سلام

از

سردار جعفری

سردار جعفری انسانی عظمت کا ترجمان ہے۔ وہ خوبصورت، شاندار اور بھرپور زندگی کے گیت گاتا ہے جعفری کی فکر کسی ایک نقطے پر مرکوز ہو کر نہیں رہ جاتی۔ اُس کا فن کسی دائرے میں مقیّد نہیں رہ سکتا۔ اِس بار اُس نے ادبی دُنیا کے سامنے ایک نیا شعری تجربہ، ایک نیا انقلابی تحفہ پیش کیا ہے۔

نئی دُنیا کو سلام

طویل تمثیلی نظم ہے۔ یہ نظم تاریخ کا نیا تصور، زندگی اور سماج کی نئی تفسیر، انسانی عظمت کا نیا اشارہ، آزادی اور انقلاب کی نئی نوید، سیاست اور آرٹ کا حسین امتزاج ہے۔ اِس نظم میں شاعر کے تخیّل نے اُن بلندیوں کو پالیا ہے جو اَب تک اچھوتی تھیں۔

نئی دُنیا کو سلام

کے ساتھ جعفری کی مشہور مثنوی "جمہور" بھی شامل ہے۔ ہندستان کا حُسن و جمال، اُس کی دولت و عظمت ساتھ ہی ساتھ اُس کی مفلسی، غلامی اور بے بسی اور اِس اندھیرے سے پھُوٹتی ہوئی آزادی کی کرنیں، زندگی کی نئی راہیں سب کچھ اِس مثنوی میں موجود ہے۔ "نئی دُنیا کو سلام" اور "جمہور" ترقّی پسند شاعری کی نئی منزل ہے۔

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ صفحات ۱۸۰، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش، قیمت تین روپیہ

دو نئی کتابیں

سمندر دور ہے

کرشن چندر کی تازہ ترین کہانیوں کا مجموعہ ہے جو اسی مہینہ پریس سے باہر آیا ہے اس کی خوبیوں کی ساری ضمانت کرشن چندر کا نام ہے

قیمت:۔ دو روپیہ بارہ آنے

گالی

مہندر ناتھ کے نئے افسانوں کا مجموعہ جس کا بہت دنوں سے انتظار تھا۔ یہ "چاندی کے تار" اور "نئی بیماری" کے مصنف کی تیسری کتاب ہے۔

قیمت:۔ دو روپیہ بارہ آنے

نئی دُنیا کو سلام

از

سردار جعفری

سردار جعفری انسانی عظمت کا ترجمان ہے۔ وہ خوبصورت، شاندار اور بھرپور زندگی کے گیت گاتا ہے۔ جعفری کی فکر کسی ایک نقطے پر مرکوز ہو کر نہیں رہ جاتی۔ اُس کا فن کسی دائرے میں مقیّد نہیں رہ سکتا۔ اِس بار اُس نے ادبی دُنیا کے سامنے ایک نیا شعری تجربہ، ایک نیا انقلابی تحفہ پیش کیا ہے۔

نئی دُنیا کو سلام

طویل تمثیلی نظم ہے۔ یہ نظم تاریخ کا نیا تصوّر، زندگی اور سماج کی نئی تفسیر، انسانی عظمت کا نیا اشارہ، آزادی اور انقلاب کی نئی نوید، سیاست اور آرٹ کا حسین اِمتزاج ہے۔ اِس نظم میں شاعر کے تخیّل نے اُن بلندیوں کو پالیا ہے جو اَب تک اچھوتی تھیں۔

نئی دُنیا کو سلام

کے ساتھ جعفری کی مشہور مثنوی "جمہور" بھی شامل ہے۔ ہندستان کا حُسن وجمال، اُس کی دولت وعظمت، ساتھ ہی ساتھ اُس کی مفلسی، غلامی اور بے بسی اور اِس اندھیرے سے پُھوٹتی ہوئی آزادی کی کرنیں، زندگی کی نئی راہیں سب کچھ اِس مثنوی میں موجود ہے۔ "نئی دُنیا کو سلام" اور "جمہور" ترقّی پسند شاعری کی نئی منزل ہے۔

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ صفحات ۱۸۰، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش، قیمت تین روپیہ

دو نئی کتابیں

سمندر دُور ہے

کرشن چندر کی تازہ ترین کہانیوں کا مجموعہ ہے جو اسی مہینہ پریس سے باہر آیا ہے اس کی خوبیوں کی ساری ضمانت کرشن چندر کا نام ہے

قیمت: دو روپیہ بارہ آنے

گالی

مہندر ناتھ کے نئے افسانوں کا مجموعہ جس کا بہت دنوں سے انتظار تھا۔ یہ "چاندی کے تار" اور "نئی بیماری" کے مصنف کی تیسری کتاب ہے۔

قیمت: دو روپیہ بارہ آنے

کتب پبلشرز لمیٹڈ

بمبئی نمبر ۱

ہمارا کتب خانہ

کتب پبلشرز لمیٹڈ سے آپ کو دوسرے ناشرین کی کتابیں بھی مل سکتی ہیں

۱ - ایک گرجا ایک خندق	(کہانیاں)	کرشن چندر	قیمت	ساڑھے تین روپیہ
۲ - سمندر دُور ہے	(کہانیاں)	کرشن چندر	قیمت	دو روپیہ بارہ آنے
۳ - پودے	(رپورتاژ)	کرشن چندر	قیمت	دو روپیہ
۴ - پاؤں میں پھول	(کہانیاں)	احمد عباس	قیمت	ڈھائی روپیہ
۵ - زادِ راہ	(کہانیاں)	منشی پریم چند	قیمت	تین روپیہ
۶ - بیوہ	(کہانیاں)	منشی پریم چند	قیمت	ڈھائی روپیہ
۷ - اور انسان مر گیا	(ناول)	رامانند ساگر	قیمت	چار روپیہ
۸ - آنکھ مچولی	(کہانیاں)	شکیلہ اختر	قیمت	ڈھائی روپیہ
۹ - نئے اور پرانے چراغ	(تنقید)	آل احمد سرور	قیمت	چار روپیہ
۱۰ - افادی ادب	(تنقید)	اختر انصاری	قیمت	سوا روپیہ
۱۱ - ادب اور انقلاب	(تنقید)	اختر رائے پوری	قیمت	

ان کے علاوہ

آپ کو اور جس کتاب کی ضرورت ہو وہ آپ ہمارے
مکتبے سے طلب کر سکتے ہیں

کتب پبلشرز لمیٹڈ ، ریگل بلڈنگ

اپالو بندر - بمبئی ۱

انجمن ترقی پسند مصنفین کا ماہنامہ

نیا ادب

مارچ سنہ ۱۹۴۹ء
جلد ۱۱ نمبر ۳

ادارہ

سردار جعفری
کرشن چندر
احمد عباس

کتب پبلشرز لمیٹڈ
ریگل بلڈنگ اپالو بندر بمبئی ۱

سالانہ چندہ	آٹھ روپیہ	قیمت فی پرچہ
ششماہی	ساڑھے چار روپیہ	بارہ آنہ

فہرست

حرفِ آغاز

حیدرآباد کی فوجی حکومت نے وہاں کے مقبول اور جواں سال ترقی پسند شاعر سلیمان اریب کو کئی ماہ سے جیل میں بند کر رکھا ہے۔ جب کہ حیدرآباد کے بہت سے ادیبوں پر فرقہ پرستی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ اور وہ قاسم رضوی اور انجمن اتحاد المسلمین کی خوشامد میں مصروف تھے اور رضاکاروں میں شامل ہو رہے تھے، اس وقت بھی سلیمان اریب ان چند باہمت اور ایماندار ادیبوں میں سے ایک تھا جس کی آواز فرقہ پرستی اور جاگیرداری ظلم و تشدد کے خلاف بلند ہوئی۔ اس نے اپنے ضمیر اور شاعری کی آزاد آواز کو فروخت نہیں کیا۔ لیکن آج حق و صداقت کے اس بے باک سپاہی کو جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا ہے۔ یہ تہذیب اور ادب پر ایک اور حملہ ہے جو ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے۔ حکومت سے یہ پوچھنا بیکار ہے کہ اس ملک میں آزادئ تحریر و تقریر کا کیا حشر ہوگا۔ وہ تو ہمارے سامنے ہے۔ اصل میں ہم ادیبوں اور فن کاروں کو اپنی ذات سے یہ سوال کرنا ہے کہ ہمارے ملک میں آزادئ تحریر و تقریر کا کیا حشر ہوگا۔ تہذیب اور تمدن کا کیا حشر ہوگا۔ ادب اور فن کا کیا حشر ہوگا۔ ہم حکومت حیدرآباد سے یہ مطالبہ ضرور کرتے ہیں کہ وہ سلیمان اریب کو فوراً رہا کرے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہندستان کے تمام ترقی پسند ادیبوں اور فن کاروں اور اداروں سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس ادب دشمنی کے خلاف احتجاج کریں۔ جب کوئی حکومت شاعروں اور ادیبوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے تو سمجھ لیجئے کہ رجعت پرستی کا اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے اور اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو ہمارے ادب اور کلچر کو سخت نقصان پہنچے گا۔ جہاں شاعر کی آواز آزاد نہیں رہ سکتی۔ وہاں کوئی آزاد نہیں رہ سکتا۔

ابھی ہم سلیمان اریب ہی کی گرفتاری اور قید پر احتجاج کر رہے تھے کہ شمالی ہندستان سے نئی گرفتاریوں کی خبر آگئی، لکھنؤ میں ہندی کے مشہور افسانہ نگار اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری یش پال، اردو کی افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں، ہفتہ وار جمہور کے ایڈیٹر فضل عباس کاظمی کو گرفتار کر لیا گیا ہے، اسکولوں میں تعلیم دینے والی دو خواتین ہاجرہ بیگم اور سعیدا تیواری کو بھی گرفتار کیا گیا ہے، علی گڈھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری اور شاعر خلیل الرحمٰن اعظمی کو اور فتح گڈھ میں اردو کے مشہور شاعر غلام ربانی تاباں کو اور فیروزپور میں انجمن کے سکریٹری ستیہ پال کو جیل میں ٹھونس دیا گیا ہے، یہ سب ہندی اور اردو کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر ہیں اور انجمن کے عہدیدار ہیں، اور ان کی گرفتاری براہ راست ترقی پسند ادبی تحریک پر حملہ ہے، ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ جس حکومت کا ملک کے ادیبوں اور فنکاروں کے ساتھ یہ سلوک ہو اس حکومت کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ہونا چاہئے، یہ سخت گیری صرف فاشسٹ حکومتوں کی خصوصیت ہے ہم حکومت کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہندستان کا کوئی ادیب کوئی شاعر اس تشدد کو برداشت نہیں کرے گا۔

آجکل ملک کے کونے کونے میں بے شمار گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔ قانون تحفظ عامہ کے تحت شہر ویران اور قید خانے آباد کئے جا رہے ہیں۔ بہانہ یہ ہے کہ ریلوے ہڑتال کا خطرہ ہے۔ لیکن ہم حکومت سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ گرفتار ہونے والے ادیبوں اور شاعروں میں کتنے ریلوے یونینوں کے ممبر ہیں۔ کتنے ریلوے مزدور ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو اس لئے پکڑا جا رہا ہے کہ ان کی آواز حق اور انصاف کی حمایت میں اٹھتی ہے؟۔ لیکن حق اور انصاف کی آواز قید خانوں میں بند نہیں کی جا سکتی۔ کیا ہٹلر اور مسولینی اس آواز کو دبا سکے تھے؟ کیا چیانگ کائی شک اس آواز کو دبا سکا۔ یہ آواز قید خانوں کی دیواروں کو توڑ کر باہر نکلے گی، اور سارے ہندستان میں نہیں ساری دنیا میں گونجے گی۔

ہم انجمن ترقی پسند مصنفین کی تمام شاخوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ احتجاجی جلسے کریں اور اپنے ادیبوں اور شاعروں کی رہائی کا پرزور مطالبہ کریں اور اس وقت تک مطالبہ کرتے رہیں جب تک وہ رہا نہ ہوجائیں۔ اپنی تجویزوں کی ایک نقل، نیا ادب کے دفتر میں اور ایک ایک نقل یوپی اور مشرقی پنجاب کے ہوم منسٹروں کے پاس بھیج دیں تاکہ انھیں معلوم ہو کہ ادیب اور شاعر جو ملک اور قوم کے ضمیر کی آواز ہیں ان کی حکومتوں کی اس حرکت کو کتنی نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

بمبئی کی انجمن نے ایک احتجاجی تجویز منظور کی ہے جس میں ان ادیبوں اور شاعروں کی غیر مشروط اور فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ملک راج آنند، کرشن چندر، ساغر نظامی، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، مجروح سلطانپوری، وشوامتر عادل اور سردار جعفری نے ایک الگ بیان بھی شائع کیا ہے۔ ان کی نقلیں، یو۔پی اور پنجاب کے ہوم منسٹروں کے پاس بھیج دی گئی ہیں۔

تجویز کا ایک اقتباس

"حکومت کا یہ حملہ صرف ادب اور تہذیب ہی پر نہیں بلکہ سارے ملک کی آزادی پر ہے۔ جن شاعروں اور ادیبوں کو گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ ہماری تحریک آزادی کے بے باک سپاہی بھی ہیں۔ ہم یہ نتیجہ نکالنے پر اس لئے اور بھی مجبور ہیں کہ تمام گرفتاریاں ریلوے مزدوروں کی ہڑتال کے سلسلے کی گرفتاریوں کے ساتھ عمل میں آئی ہیں اور حکومت نے کسی پر کوئی فرد جرم قائم نہیں کی ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ حکومت یہ سمجھتی ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر عوام اور مزدور طبقے کے ساتھ ہیں۔ شاعر اور ادیب ملک اور قوم کے دل و دماغ ہیں۔ اس کا ضمیر ہیں اور حکومت کو یہ سوچنا چاہیے کہ اگر اس کے ساتھ ملک کا دل و دماغ اور ضمیر نہیں ہے تو پھر کون اس کے ساتھ ہے، اس لئے ہمیں یقین ہے کہ جبر و تشدد کی اندھی طاقت کی نہیں ہے تو پھر کون اس کے ساتھ ہے۔ اس لئے ہمیں یقین ہے کہ جبر و تشدد کی اندھی طاقت کی نہیں بلکہ آخر میں ہمارے دل و دماغ اور ضمیر کی فتح ہوگی، شعر اور نغمہ، ادب اور تہذیب، عوام اور جمہور کی فتح ہوگی، اس لئے ہم ان گرفتاریوں پر اپنے غم اور غصّے کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس مسرت کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ ہم اور ہمارے ساتھی، دوسرے ادیب عوام کی انقلابی صفوں کے ساتھ ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ادب اور انقلاب کے اس اتحاد کو ختم نہیں کر سکتی۔"

ادبی معلومات

ادیبوں کی بین الاقوامی کمیٹی

امن اور تہذیب کی حفاظت کے لئے پولینڈ کے شہر روکلا میں (اس کا تلفظ "ورسلا" بھی ہے) دنیا کے ادیبوں اور دانشوروں کی جو کانفرنس اگست ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی، اس کا اعلان نامہ اکتوبر ۱۹۴۸ء کے نیا ادب میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کانفرنس نے ادیبوں کی ایک بین الاقوامی لیزاں کمیٹی مقرر کی تھی، جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ دنیا کے ہر ملک میں امن و تہذیب کی حفاظت کے لئے ادیبوں کی قومی کمیٹیاں بنائے اور وقتاً فوقتاً حالات کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ شائع کرتی رہے۔

فروری کے پہلے ہفتے میں پیرس میں لیزاں کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ جس میں سوویت یونین، امریکہ، فرانس، چیکوسلاواکیہ، برطانیہ، ہنگری، برے زیل، چلی، سگاتی مالا، کیوبا، اٹلی، میکسکو، پولینڈ، سوئزرلینڈ، پرتگال، اور یوراگوے کے نمائندوں نے شرکت کی۔

۹ر فروری کو لیزاں کمیٹی نے جو اپنا کمیونکے شائع کیا ہے اس میں بتایا ہے کہ روکلا کانفرنس کے فیصلوں کا استقبال دنیا کی رائے عامہ نے بڑی گرم جوشی سے کیا ہے، بہت سے ممالک میں خصوصیت کے ساتھ فرانس، اٹلی، برطانیہ اور برے زیل میں قومی کمیٹیاں بن گئی ہیں۔ جن میں مختلف سیاسی عقائد کے ادیب اور دانشور شامل ہیں۔ روکلا کانفرنس کے فیصلوں کے مطابق اور قومی کمیٹیوں کی رہنمائی میں فرانس، اٹلی، برطانیہ، امریکہ، رومانیہ، میکسکو اور یوراگوے کے ادیب امن اور تہذیب کی حفاظت کے لئے اپنے اپنے ملکوں میں قومی کانفرنس کرنے کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ بین الاقوامی لیزاں کمیٹی ان قومی کمیٹیوں کے کام سے مطمئن ہے، اور ہر ملک کے ادیبوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اپنے اپنے یہاں تمام جمہوری عناصر کے ساتھ مل کر ادیبوں اور دانشوروں کی قومی کانفرنسیں کریں۔

لیزاں کمیٹی نے اپنے کمیونکے میں یہ بھی کہا ہے کہ یہ تحریک اس صورت میں زیادہ موثر ثابت ہوگی جب اس جدوجہد میں، سائنس، ادب اور آرٹ کے میدانوں میں کام کرنے والے تمام دانشور ایک ساتھ مل کر کام کریں۔ اس لئے بین الاقوامی لیزاں کمیٹی تمام قومی کمیٹیوں کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ اپنے سائنس والوں، ادیبوں اور فنکاروں کو متحد کریں تاکہ ان کی ذاتی تخلیقی کاوشیں عالمگیر امن کے لئے مفید ثابت ہو سکیں۔

کمیونکے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں ادیبوں اور دانشوروں پر جبر و تشدد بڑھ گیا ہے۔ ترکی میں وہاں کے ادیب سبہاتن علی کو قتل کر دیا گیا۔ ہندستان میں ترقی پسند مصنفین (اردو) کے سکریٹری علی سردار جعفری کو جیل میں بند کر دیا گیا۔ چلی کے شاعر پبلو نرودا اور کیوبا کے شاعر نکولاس گلیان اور ادیب میرنیلو کو پولس پریشان کر رہی ہے، امریکہ کا ادیب ہاورڈ فاسٹ جیل میں ہے۔ برے زیل کا ادیب اماڈو اور براڈو اور وہاں کے سائنس داں ماریو شوں برگ کو ستایا جا رہا ہے، فرانس اور اٹلی میں یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے پروفیسروں کو اس جرم میں کام سے برطرف کر دیا گیا ہے کہ انھوں نے روکلا کانفرنس میں حصہ لیا تھا۔ اس طرح دنیا کی جنگجو طاقتیں ان آوازوں کا گلا گھونٹنا چاہتی ہیں جو جنگ کے بڑھتے ہوئے خطرے کے خلاف بلند ہو رہی ہیں۔ ان خوفناک علامتوں کے پیش نظر بین الاقوامی لیزاں کمیٹی ایک بار پھر امن کی حفاظت کے لئے جدوجہد کرنے کا عہد کرتی ہے۔ کمیٹی اپنا کام کرتی رہے گی، اور دنیا کے تمام ممالک میں امن کی حفاظت کرنے والی تحریکوں کو مدد دیتی رہے گی۔

۸

ترقی پسند مصنفین (اردو) کی تیسری سالانہ کانفرنس

انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کی شاخ بمبئی نے مرکز کو اطلاع دی ہے کہ وہ اردو کی تیسری کل ہند سالانہ کانفرنس کے تمام انتظامات کرنے کے لئے تیار ہیں اور یہ مشورہ دیا ہے کہ کانفرنس مئی کے مہینے میں بلائی جائے، اس مقصد کے لئے بمبئی کی شاخ نے دس ہزار روپیہ جمع کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور ڈاکٹر ملک راج آنند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، ساغر نظامی، سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، رمیش سنہا اور دوسرے ادیبوں پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے جس نے چندہ جمع کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ کانفرنس کی صحیح تاریخوں کا فیصلہ دوسری شاخوں کے مشورے سے کیا جائے گا۔ جس کے لئے مرکز کی طرف سے سرکلر بھیج دیا گیا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین (کل ہند) کی مجلس عاملہ کے بعض ممبروں نے مشورہ دیا ہے کہ اسی کانفرنس کے ساتھ ساتھ انجمن کی تمام زبانوں کی پانچویں کانفرنس بھی بمبئی میں بلائی جائے۔ انجمن کی چوتھی کانفرنس ۱۹۴۳ء میں ہوئی تھی، سجاد ظہیر اس کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے تھے، لیکن گذشتہ سال انھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور اب انجمن کے جوائنٹ سکریٹری خواجہ احمد عباس ان کی جگہ کام کر رہے ہیں۔

ان دونوں کانفرنسوں کے متعلق کل اطلاعات اور صحیح تاریخوں کا اعلان اپریل کے نیا ادب، نیا ساہتیہ اور دوسرے ترقی پسند رسائل میں کیا جائے گا۔

علی گڑھ کے ترقی پسند ادیبوں کا بیان

ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے ان تمام ادیبوں اور فن کاروں پر پابندی لگا دی ہے جو اپنی تحریروں میں عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کے حقوق کے لئے آواز اٹھاتے ہیں۔ وہی رہنما جو کل تک شہری آزادی، اور تحریر و تقریر کی پابندیوں کی وجہ سے غیر ملکی حکومت سے نالاں تھے، آج برسر اقتدار آتے ہی وہ تمام حربے استعمال کر رہے ہیں جو حکومت برطانیہ مدت سے ہندستانیوں کے جذبۂ آزادی کو دبانے کے لئے کرتی آئی تھی، وہ تمام اخبارات و رسائل جنھوں نے فرقہ وارانہ طاقتوں اور سرمایہ دارانہ مظالم کے خلاف آواز اٹھائی آج حکومت کے عتاب کی زد میں ہیں، نیا دور، جن شکتی اور سوادھینتا بند کر دئے گئے، پیپلز ایج، نیا زمانہ، اور جن یگ کا داخلہ مختلف صوبوں میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ پاکستان کے ترقی پسند رسائل سویرا، ادب لطیف، اور نقوش پر چھ چھ ماہ کے لئے اس لئے پابندی لگا دی گئی ہے کہ ان رسالوں کے صفحات میں سرمایہ داری اور فرقہ واریت کے گھناؤنے چہروں کو بے نقاب کیا گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان ادیبوں پر مقدمہ بھی چلایا گیا۔ جنھوں نے اپنی تحریروں میں رجعت پسند عناصر کی مخالفت کی اور عام انسانوں کا دکھ درد محسوس کیا۔ خواجہ احمد عباس، یش پال، اور اردو، ہندی، گجراتی، مراٹھی وغیرہ زبانوں کے ادیبوں پر نام نہاد قانون "تحفظ عامہ" کی آڑ لے کر یہ عتاب نازل کیا جا چکا ہے۔ کرشن چندر، کیفی اعظمی اور دوسرے شاعروں، افسانہ نگاروں اور اخبار نویسوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ حکومت وقت کے خلاف کوئی بات نہ لکھیں۔ تحریر و تقریر کی اس پابندی کے خلاف جب ہمارے ادیبوں نے احتجاج کیا تو بمبئی کی حکومت نے ڈی۔ الیف۔ کراکا، رومیش چندر اور کرنجیا ایڈیٹر بلٹز کو گرفتار کر لیا تھا۔

ابھی حال ہی میں حیدرآباد کی حکومت نے بھی اس قسم کا قدم اٹھایا ہے اور وہاں کے مشہور ترقی پسند شاعر سلیمان ادیب کو جیل میں بند کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ حیدرآباد کے کسانوں، مزدوروں اور تلنگانہ کے انقلاب پسندوں کا حامی تھا۔

ہندستان اور پاکستان کی حکومتیں اپنے اس غیر جمہوری طرز عمل میں ایک ہی راہ پر گامزن نظر آتی ہے۔ وہ ان تمام ادیبوں

اور شاعروں کی زبانیں بند کر دینا چاہتی ہیں۔ جو انسانیت کے ترجمان ہیں اور ایک اچھے نظام کی آرزو رکھتے ہیں۔ جو سرمایہ داری۔ فرقہ واریت فاشزم اور ظالم حکومتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

ہم ان حکومتوں کی اس انسانیت کش اور ادب دشمن پالیسی کی سخت مذمت کرتے ہیں اور ان پابندیوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ اگر ان حکومتوں کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ قومی حکومتیں ہیں اور عوام کی فلاح وبہبودی ان کا مقصد ہے تو انھیں ٹھنڈے دل سے اپنی پالیسی پر غور کرنا چاہیے اور اپنے رویے پر نظر ثانی کرنی چاہیئے۔

اس بیان پر مندرجہ ذیل ادیبوں کے دستخط ہیں

(۱) اختر انصاری، (۲) معین احسن جذبی (۳) ابوالفضل صدیقی، (۴) خورشید الاسلام (۵) خلیل الرحمٰن اعظمی، (۶) باقر مہدی، (۷) محمد مثنیٰ رضوی (۸) فرید بخش قادری (۹) علی حماد عباسی (۱۰) سید حسن عسکری (۱۱) زہرا خاتون (۱۲) خالدہ حیدر (۱۳) متین الزماں (۱۴) ریاض الدین قیصر (۱۵) زبیدہ محمود (۱۶) خدیجہ زیدی (۱۷) کملا دیوی (۱۸) سائرہ تسنیم (۱۹) ظہیر الحق (۲۰) شاہد حسن صدیقی (۲۱) سید علی نقوی (۲۲) جعفر حسن (۲۳) شہاب جعفری (۲۴) محمود الحسن (۲۵) غلام حسین نحوی (۲۶) آفتاب عالم (۲۷) مرزا ممتاز حسین (۲۸) سلامت اللہ (صدر انجمن)

بہار کے ترقی پسند ادیبوں کا اعلان نامہ

ہم ترقی پسند ادیب ہندستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی مکمل ہمنوائی کرتے ہیں۔ اس کی پالیسی کو اپنی پالیسی سمجھتے ہیں۔ اس تنظیم کو ادب آرٹ اور کلچر کی قدروں کا محافظ سمجھتے ہیں اور اسی لئے اس بات کی ضرورت سمجھتے ہیں کہ اس تنظیم کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور ہمہ گیر بنانے کی جدوجہد کا آغاز کریں۔

ہم بہار میں اس تحریک کی ترقی اور تنظیم کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے ایک تاریخی فرض سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں

کہا جاتا ہے تقریباً سوا سال قبل ہندستان کو آزادی مل گئی۔ ہم دیکھتے ہیں آزادی ملی تو ضرور ہے۔ لیکن وہ آزادی ہے برلا اور ٹاٹا کی، معاشی اور سماجی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی ہے، معاشی بحران سے عوام پریشان ہیں، ہر طرف فسطائی ذہن سے کام لیا جا رہا ہے مزدوروں کی تحریکیں ممنوع قرار دی جا چکی ہیں، کسانوں کو خدائی قہر سے ڈرایا جا رہا ہے، طلبا کی مانگوں کو لال پگڑی روندتی چلی جا رہی ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کی پارٹیوں پر روک لگا دی گئی ہے۔ مزدوروں، کسانوں، اور طلبا کے رہناؤں کو جیل میں ٹھونس دیا گیا ہے اور تو اور خود کلچر ادب اور آرٹ پر براہ راست حملے ہونے لگے ہیں۔ ٹیگور کی نظم پر ممانعت عائد ہوتی ہے تو کبھی شکسپیر کے ہملٹ کو مردود قرار دیا جاتا ہے اور اس پر وہ نشتر زنی ہوتی ہے کہ موجودہ مہذب حکومت کی اخلاق پروری پر وجد آنے لگتا ہے، خواجہ احمد عباس کی کہانی پر مقدمہ چلایا جاتا ہے، پریس اور شہری حقوق کا گلا دبایا جاتا ہے، رمیش چندر جیل میں ہیں، ٹی۔ بی کے مریض بہار دوانح کو اسی آزاد ہندستان میں جس شان دلربائی سے جیل کی چہار دیواریوں کے پیچھے موت کے سپرد کیا گیا ہے، موجودہ حکومت کے سماجی کیرکٹر کا آئینہ دار ہے، امریکی سرمایہ دارانہ صنعتی اجارہ داری کے بھروسے پر ملک گیری کے ہوس کو ڈالر ہی ڈھال چکی ہے اور ساری دنیا کی سرمایہ داری ایک ساتھ جمہور اور طبقاتی جدوجہد پر حملہ کر رہی ہے، اس کا اثر بھی ہندستان پر پڑ رہا ہے، اخلاق، علم، کلچر، آرٹ، اور ادب کی تو اندھیوں سے گھری ہوئی ہے۔ اور جب انسان کے روحانی اور اخلاقی قدروں پر حملہ ہونے لگے تو سمجھنا چاہیے کہ انسانیت ایک بڑے امتحان کی منزل سے گذر رہی ہے

ہمیں ایمانداری سے اس لو کے گرد سینہ سپر ہو کر حصار کر لینا چاہئے، جو صدیوں کی محنت و مشقت اور روحانی و اخلاقی، ارتقا کا سرمایہ ہے اور ہمارا محبوب اور مبارک ورثہ ہے۔ آج اسی ورثے پر حملہ ہو رہا ہے، ادیبوں اور شاعروں کو دھن کے ذریعہ بے بال و پر کرنے کی کوشش آج بے نقاب ہیں۔ گوپال ہلدار جیسا بنگالی نقاد آج بے دست و پا ہے، ہم ترقی پسند ادیب اس دمن کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں کہ اس کے خلاف ہم اپنے محاذ سے جنگ جاری رکھیں گے، ہماری نظمیں اور کہانیاں ان تقاضوں سے کبھی غداری نہیں کریں گی۔

آج اردو اور ہندی کا مسئلہ زور پکڑ رہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ رجعت پسند طاقتیں اپنی سرمایہ دارانہ پالیسی کی بنا پر اردو کے خلاف شاونزم کا پرچار کر رہی ہیں، حالانکہ ایک عوامی زبان کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ دوسری زبانوں کا احترام کیا جائے، اور ان سے استفادہ کی کوشش کی جائے، ہندی اور اردو میں سے جو اپنے اندر گڑے مردے کو اکھیڑنے کی کوشش کرے گی، وہ عوام کی زبان نہیں ہو سکتی، جہاں تک آسان اردو اور آسان ہندی کا تعلق ہے دونوں بہت قریب ہیں، اسی لئے ہمارا خیال ہے کہ ہندی اور اردو کے ادیبوں کو ایک دوسرے کی زبان کا پورا گیان حاصل کرنا چاہئے اس طرح میل جول سے دونوں زبانوں کو عوام سے قربت اور جانکاری کا موقع ملے گا۔ جب ایک زبان کی جڑ عوام کی زندگی میں ہوگی تو وہ زبان نہیں مرے گی عوام امر ہیں۔ اس لئے وہ زبان جو ان کے اندر رہےگی دراصل اس مچھلی کی طرح ہوگی، جو پانی کے اندر ہے، اردو ہندی کے ادیبوں کا بنیادی فرض ہے کہ وہ عوام اصلی پیاسوں، ان کے تقاضوں اور ضرورتوں کو اپنی زبان میں جگہ دیں، اور اسے اس بھیانک خطرے سے بچائیں جو شدھ ہندی اور سلیس اردو کی نقاب اوڑھ کر بڑھ رہا ہے۔ ماضی پرستی، کا مقابلہ ضروری ہے، اور ہم اس کا مقابلہ اسی وقت کر سکتے ہیں، جب اپنے مریض سماج کو سمجھیں اور اس کو ختم کرنے کے لئے، عوامی طاقتوں کا بے دھڑک ساتھ دیں، تاخیر اور ہچکچاہٹ ہمیں فنا کی طرف لے جائے گی۔ ساتھیو! کیا سوچتے ہو! کام کرو، لکھو، اور آگے بڑھو،

دستخط کرنے والے:- (۱) سہیل عظیم آبادی، (۲) پرویز شاہدی (۳) حسن سمیع (۴) خلیل احمد (۵) جابر اروی (۶) یونس رمزی (۷) رفیق جابر (۸) اختر پیامی (۹) انور عظیم (۱۰) حسن نعیم (۱۱) قاضی سعید احمد (۱۲) بدیع مشہدی (۱۳) مسعود ملک (۱۴) کلام حیدری (۱۵) شاہد انور (۱۷) پرویز مشہدی (۱۸) نوشاد نوری، (۱۹) ضبط کاظمی ؛

بھوپال کے ترقی پسند مصنفین کی تجویز

انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ ہند کی مرکزی، صوبائی، اور ریاستی حکومتوں کی اس پالیسی کی مذمت کرتا ہے جو انھوں نے ادیبوں، مزدوروں، کسانوں، ملازموں، طالب علموں، اور عوام کی آزادی کی ترقی پسند تحریکوں کو کچلنے کے لئے اختیار کی ہے،

مختلف طریقوں سے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ ترقی پسند جماعتوں کا آزاد فضا میں سانس لینا دوبھر کر دیا جائے۔ چنانچہ حال ہی میں بمبئی کے ادیب یش پال ڈاکٹر رشید جہاں، سجاد انیواری، خلیل الرحمن، ہاجرہ بیگم، اودھوکمار، کاظمی، مقصود عرفاں، اور دوسرے ادیبوں کو جیل کی چار دیواری میں مقید کر دیا گیا ہے، علی سردار جعفری، آرگنائزنگ سکریٹری کل ہند ترقی پسند مصنفین کی گرفتاری بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یہ جلسہ حکومت کے اس رویہ کو بھی جمہوری آئین کے منافی سمجھتا ہے جو حکومت نے کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں کو عملاً ختم کر دینے کے لئے اختیار کر رکھا ہے۔ حکومت کا سرمایہ داروں سے تعاون اور ابھی بیس سال تک صنعتوں کو قومی ملکیت نہ بنایا جانا۔ ہندستان کے عوام کی بہتری اور ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے،

یہ جلسہ حکومت کی اس انسانیت سوز پالیسی کو انتہائی غم و غصہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جس کا مظاہرہ حکومت نے کلکتہ کے طالب علموں

اور ان سے ہمدردی رکھنے والے عوام پر جن میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ اندھا دھند گولیاں برسا کر ملنگانہ کے بہادر کسانوں پر وحشیانہ حملوں کی صورت میں اور ریلوے و پوسٹل یونینوں کے اراکین کو گرفتار کر کے کیا ہے، اس طرح حکومت ہند کی یہ غیر جمہوری پالیسی اب فسطائیت کی حد تک پہونچ چکی ہے جو کانگریس کی سرمایہ نواز پالیسی کا لازمی نتیجہ ہے ہندستان اور بھوپال کے فن کار ان تلخ حقیقتوں سے منہ نہیں موڑ سکتے، کہ جمہوریت کی دعویدار کانگریسی سرکار نے کامن ویلتھ میں شریک ہونے کا اعلان کر کے دنیا کے سامراجی کیمپ سے ساز باز کر لیا ہے اور سرمایہ داروں، راجوں، اور نوابوں، کی ہی نہیں بلکہ فسطائی اور فرقہ پرست طاقتوں کو بھی بڑھاوا دینے کی پالیسی اختیار کر لی ہے،

حکومت کے اس فسطائی اور عوام دشمن طرز عمل نے ملک کے تمام ادیبوں اور ترقی پسند عناصر کے لئے شہری آزادی، اور جمہوری حقوق کے تحفظ کا بنیادی سوال پیدا کر دیا ہے جس کو ایک آزاد شہری اور مخلص فن کار کی حیثیت سے ترقی پسند مصنفین کا کوئی رکن کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا۔ لہذا انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ ہند کی مرکزی، صوبائی اور ریاستی حکومتوں کی اس غیر جمہوری پالیسی کی پر زور مذمت کرتے ہوئے مطالبہ کرتا ہے کہ تمام گرفتار شدہ ساتھیوں کو فوراً غیر مشروط طور پر رہا کیا جائے، اور شہری آزادی کو بحال کر کے تحریر و تقریر اور پریس کی پابندیوں کو اٹھایا جائے، تاکہ ہندوستان کے عوام بھی جمہوریت کی طرف قدم بڑھا سکیں۔

مجوز — قمر جمالی

موئید — سندر لال، فرید انصاری، اختر سعید خان، جاں نثار اختر
احسن علی۔ صہبا لکھنوی، محمد ادریس کیف

ہماری کتابیں

۱- اجنتا سے آگے (کہانیاں) از کرشن چندر قیمت دو روپیہ بارہ آنہ
۲- ہم وحشی ہیں (کہانیاں) از کرشن چندر قیمت ڈیڑھ روپیہ
۳- چغد (کہانیاں) از سعادت حسن منٹو قیمت سوا تین روپیہ
۴- زعفران کے پھول (کہانیاں) از خواجہ احمد عباس قیمت دو روپیہ بارہ آنہ
۵- قلی (ناول) از ڈاکٹر ملک راج آنند قیمت ساڑھے چھ روپیہ
۶- گالی (کہانیاں) از مہندر ناتھ قیمت دو روپیہ بارہ آنہ

۷- نئی دنیا کو سلام (نظمیں) از سردار جعفری قیمت تین روپیہ
۸- آخر شب (نظمیں) از کیفی اعظمی قیمت تین روپیہ
۹- سب رنگ (نظمیں) از اختر الایمان قیمت ڈیڑھ روپیہ

۱۰- دھانی بانکیں (ڈرامہ) از عصمت چغتائی قیمت ایک روپیہ
۱۱- اردو ہندی ہندستانی (مقالہ) از سجاد ظہیر قیمت بارہ آنے

۱۲- اسرار الحق مجاز (نئے ادب کے معمار) از عصمت چغتائی قیمت ایک روپیہ
۱۳- سعادت حسن منٹو (نئے ادب کے معمار) از کرشن چندر قیمت ایک روپیہ
۱۴- دیوندر ستیارتھی (نئے ادب کے معمار) از ساحر لدھیانوی قیمت ایک روپیہ
۱۵- مخدوم محی الدین (نئے ادب کے معمار) از سردار جعفری قیمت ایک روپیہ
۱۶- عصمت چغتائی (نئے ادب کے معمار) از کرشن چندر قیمت ایک روپیہ
۱۷- ساحر لدھیانوی (نئے ادب کے معمار) از کیفی اعظمی قیمت ایک روپیہ

زیر طبع

۱- کوکھ جلی (کہانیاں) راجندر سنگھ بیدی
۲- نیا قاعدہ (کہانیاں) کرشن چندر
۳- تراس میں آس (کہانیاں) صالحہ عابد حسین
۴- سازِ لرزاں (نظمیں) غلام ربانی تاباں
۵- فروزاں (نظمیں) معین احسن جذبی
۶- خون کی لکیر (نظمیں اور افسانے) سردار جعفری
۷- نئی شاعری کی بنیادیں (تنقید) سردار جعفری
۸- ادب اور تہذیب (مضامین) سردار جعفری
۹- ادب اور سماج (تنقید) احتشام حسین
۱۰- غالب کی شاعری (تنقید) ممتاز حسین
۱۱- میکسم گورکی (حالات زندگی اور افسانوں کا انتخاب)
۱۲- روسی ادب (دو جلدوں میں)
۱۳- پھانسی کے سائے میں (ایک انقلابی شہید کی کہانی)
۱۴- گناہ اور سائنس
۱۵- سماج کا ارتقاء کلیم اللہ

کتب پبلشرز لمیٹڈ۔ ریگل بلڈنگ، اپالو بندر بمبئی نمبر ۱

خواجہ احمد عباس ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳ سے چھپوا کر کتب پبلشرز لمیٹڈ ریگل بلڈنگ اپالو بندر بمبئی نمبر ۱ سے شائع کیا

کرشن چندر

ادب کا نیا موڑ

بھوپال کانفرنس کی رپورٹ

بھوپال کی ترقی پسند مصنفین کانفرنس میں شرکت کے لئے ہم لوگ ۲۵ جنوری کی صبح کو بھوپال پہونچے، سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے قریب کانفرنس کا پہلا اجلاس حمیدیہ کالج کے وسیع ہال میں منعقد ہوا، حاضری بہت کم تھی پانچ سو سے زیادہ نہ ہوگی زیادہ تعداد طلبہ کی تھی، اور سرکاری ملازمین کی چند کانگریسی وزرار بھی شریک محفل تھے خواتین کے لئے پردے کا انتظام تھا، افتتاح سید سلیمان ندوی نے فرمایا۔ علامہ موصوف نے اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا۔ کہ انھوں نے اکثر و بیشتر ترقی پسند مصنفوں کو پڑھا ہیں ہے، ان کے متعلق سنا ضرور ہے۔ پھر انھوں نے جو کچھ سنا تھا۔ ہمارے متعلق وہ سب فرمادیا گذشتہ دس سالوں میں ہماری تحریک پہ جا الزامات اور بہتانات تراشے گئے ہیں وہ سب علامہ موصوف نے یکجا اکٹھے کر کے سنا دیئے، اور پھر اد اسے کہ طور پر یہ بھی فرمادیا کہ وہ ان الزامات میں یقین نہیں رکھتے ہیں۔ اور جو شبہات انھیں ترقی پسندوں سے ہیں۔ وہ بھی خود بخود دور ہو جائیں گے۔ اس دلچسپ افتتاح کے بعد صدر استقبالیہ کمیٹی نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا جس میں ان تمام الزامات کا جواب موجود تھا۔ جس کا ذکر علامہ سید سلیمان ندوی کی تقریر میں آچکا تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنا صدارتی مقالہ پڑھا۔ وہ حصہ جس میں میں نے اردو کی حمایت کی تھی، حاضرین کو بہت پسند آیا جہاں میں نے موجودہ نام نہاد آزادی کی تشریح کی تھی۔ اسے بھی مجمع نے پسند کیا۔ لیکن جہاں میں نے اردو کی حمایت کرتے ہوئے۔ اسے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر بنانے کے ارادے ظاہر کئے وہاں پہ مجمع خاموش رہا۔ پھر آزادی کی تشریح کرتے ہوئے جہاں میں نے اشتراکی نظام کے حصول پر زور دیا۔ وہاں پہ بھی اس اجتماع کی خاموشی اور بے حسی اس کی شخصیت کو بے نقاب کئے دیتی تھی۔ کیونکہ اس اجتماع میں زیادہ تر اونچے طبقے کے لوگ اور ان کے بچے بالے شامل تھے، مقالے کا آخری حصہ، جس میں میں نے علی سردار جعفری کی گرفتاری کا ذکر کیا تھا۔ اور چینی انقلاب کا بھی، —— اس حصے نے خاص طور پر طلباء کی ہمدردی حاصل کرلی بعد میں گفتگو کرنے سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ طلباء اور کم تنخواہیں پانے والے ملازم پیشہ ہر مقالے سے خاصے متاثر ہیں۔ لیکن کانگریسی وزرار اور بڑے بڑے گزیٹڈ افسر اور جاگیردار طبقہ خائف اور ہراساں ہو رہا ہے۔ بعد میں بھوپال کے روزنامے ندیم میں جب پہلی اجلاس کی مفصل کاروائی چھپی تو انھوں نے اس مقالے کو پہلے صفحے پر جگہ دی اور اسے بڑی بڑی سرخیوں سے چھاپا۔ لیکن مقالے کے اقتباسات دیتے ہوئے انھوں نے بھی اردو کی حمایت اور موجودہ آزادی کی سماجی تشریح کو زیادہ جگہ دی اور اشتراکیت والا معاملہ گول کر دیا۔ اس سے یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ عوام میں اور اونچے طبقے میں بھی موجودہ آزادی کے متعلق ایک نفی جذبہ ضرور موجود ہے۔ لیکن ابھی ہماری ترقی پسند تحریک اشتراکی آزادی کے متعلق کوئی واضح تعمیری مقصد پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے بھی نہیں رکھ سکی ہے اور اسلئے یہ نفی جذبہ بہت جلد خطرناک پسپائیت میں بدل جاتا ہے۔ اور اسے کسی تعمیری مقصد کے لئے استعمال نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم نے ابھی تک عوام کے سامنے کوئی تعمیری مقصد اپنی تخلیقات میں نہیں رکھا ہے۔

دوسرے روز دوپہر کو اختر سعید صاحب کے ہاں جہاں ہم لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، بھوپال کے ترقی پسند مصنفین کے چند احباب کی ایک مختصر سی مشاورتی مجلس منعقد ہوئی۔ اس مجلس میں بھوپال کی انجمن کے سکریٹری۔ قمر جمالی صاحب۔ احسن علی خاں اور صہبا لکھنوی نے خاص طور پر حصہ لیا۔ بہت سے مسائل زیر بحث رہے، لیکن سب سے اہم موضوع "رسالہ افکار" کی پالیسی سے متعلق تھا۔ یہ رسالہ مقامی انجمن کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کچھ عرصے

سے ان میں چند ایک ایسے مضامین شائع ہوئے تھے، جس سے مقامی انجمن کو شدید اختلاف تھا۔ صہبا لکھنوی نے اس فروگذاشت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی اور بتایا کہ انکار کی بنیادی پالیسی ترقی پسند رہے گی، اور مستقبل میں اس سے انحراف نہیں ہوگا۔ اور آئندہ مقامی انجمن کے مشورے سے ایسے اقدامات کیے جائیں گے۔ جس سے انکار ترقی پسند تحریک میں بڑھ چڑھ کے حصہ لے سکے

اس روز سہ پہر کو جو اجلاس ہوا۔ اس کی صدارت شاہد لطیف صاحب نے فرمائی۔ شاہد لطیف نے اپنے مقالے میں اردو افسانے کے موجودہ دور کا جائزہ لیا۔ اس کے ترقی پسند رجحانات پر روشنی ڈالی۔ اس کی خامیوں کا بھی ذکر کیا اور مستقبل کے لئے اس کے لئے اس کے افسانہ نگاروں کے سامنے ایک کار آمد لائحہ عمل بھی پیش کیا۔ اس جائزے کا آخری حصہ مجھے تشنہ نظر آیا۔ شروع کے دو تہائی حصے میں فکری ارتقاء کی کڑیاں واضح اور مرتب ہیں لیکن آخری حصے میں مجھے تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور ایک جھٹکے کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ اور شاہد لطیف اگر آخری حصے کو بھی اسی تفصیل سے لکھ سکیں، جس سے انھوں نے اپنے مقالے کے پہلے دو تہائی حصے کو لکھا ہے۔ تو اس کی افادی حیثیت بہت بڑھ جائے گی۔

اسی رات کو کانفرنس کے تیسرے اجلاس کی صدارت پنڈت سندر لال جی نے فرمائی۔ یہاں میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں کانفرنس کے پہلے اجلاس سے حاضری بڑھ گئی تھی۔ اور دوسرے اجلاس سے تیسرے اجلاس کی حاضری زیادہ تھی، اور جس روز عصمت نے صدارت کی اس روز تو ہال میں تین ہزار سے زیادہ آدمی شامل تھے، اور کانفرنس کے آخری اجلاس میں تو ہال کھچا کھچ بھر گیا تھا بلکہ لوگ ہال کے باہر بھی کھڑے تھے۔ اس سے آپ کو لوگوں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا اندازہ ہو سکے گا۔ اب اس اجتماع کی شخصیت بھی بدلتی جا رہی تھی۔ آخر میں تین جلسوں میں مزدور اور نچلے طبقے کے لوگ ایک کثیر تعداد میں شامل تھے، اور انھوں نے کانفرنس کو کامیاب بنانے میں ہماری بہت مدد کی۔

پنڈت سندر لال جی کی تقریر گو زبان کے مسئلے پر تھی، لیکن ان کی تقریر کا زیادہ حصہ ہندو مسلم اتحاد سے متعلق تھا، جس کی وضاحت انھوں نے شروع شروع میں گاندھی وادی نقطۂ نگاہ سے کی۔ یعنی ہندو بھی غلطی پر ہے اور مسلمان بھی غلطی کرتا ہے اور ہندو یہ کرتا ہے تو مسلمان یوں کرتا ہے اور اگر ہندو ہندی میں سنسکرت یوں ٹھونستا ہے تو مسلمان اردو کو یوں مفرس اور معرب بناتا ہے۔ ہندو مذہبی تعصبات سے کام لیتا ہے تو مسلمان بھی اس میدان میں اس سے پیچھے نہیں ہے اور جب تک مذہبی رواداری سے کام نہ لیں گے ہم لوگ اکٹھے نہیں ہوں گے ہم لوگ کبھی ترقی نہیں کر سکتے، پنڈت جی نے بڑے جذباتی انداز میں پُرخلوص تقریر کی اور بیچ بیچ میں کہیں کہیں روتے بھی جاتے تھے، لیکن برابر خیال تھا کہ اجتماع کا بیشتر حصہ اس مذہبی رواداری کی سطح پر کئے گئے ہندو مسلم سمجھوتے کو چنداں اہمیت دینے کو تیار نہیں ہے۔ بلکہ میرا بھی یہ خیال ہے کہ ان مذہبی کوتاہیوں کو گنانے سے ہندو اور مسلمان دونوں کے جذبات مجروح ہوئے ہوں گے اور میرے خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اکثر و بیشتر عوام نے پنڈت جی کی تقریر کے ان حصوں کو بہت زیادہ سراہا، جس میں انھوں نے حکومت کی کوتاہیوں پر کڑی نکتہ چینی کی تھی، اور زبان کے مسئلے پر جذباتی اور مذہبی رواداری کے انداز میں نہیں بلکہ خالص اور ٹھوس عقلی اور سائنسی اعتبار سے بحث کی تھی۔

پنڈت سندر لال جی کی صدارتی تقریر کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک نہایت ہی ٹھوس، جامع اور پرمغز تقریر فرمائی۔ جو اردو زبان کی حمایت اور ہندوستانی کی تعمیر سے متعلق تھی، علامہ موصوف نے اپنے موضوع کو عام مذہبی جذبات سے الگ کر کے سوچا ہے اور اس مسئلے پر ان کے دلائل وہی ہیں اور ان کی راہ وہی ہے۔ جس پر ترقی پسند مصنفین گزشتہ دس سال سے کاربند ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی تقریر کے بعد اردو اور ہندوستانی زبان کے بارے میں دو ریزولیوشن پیش کئے گئے، جنھیں بعد میں پنڈت سندر لال جی کے مشورے سے ایک کر دیا گیا۔ اس تجویز میں اردو زبان اور اردو رسم الخط کو برقرار رکھنے کی حمایت کی گئی اور یہ بتایا گیا کہ [illegible]

جو حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں صرف ہندستانی کا نعرہ کیا معنی رکھتا ہے۔ اور اسے فسطائی طاقتیں کس طرح کلچر دشمنی کے سلسلے میں استعمال کر سکتی ہیں اور کر رہی ہیں۔ تجویز میں ہندوستانی کی تشکیل کے سلسلے میں بھی چند مشورے دے گئے ہیں۔ اس پوری تجویز پر پنڈت سندر لال جی سے کافی بحث رہی۔ بعد میں یہی تجویز متفقہ رائے سے منظور کر لی۔ اس تجویز کے محرک اختر سعید تھے اور اس کی تائید پروفیسر احسن علی خاں نے فرمائی۔ احسن علی خاں کی تقریر گو اس تجویز سے متعلق تھی، لیکن صاحب موصوف نے بڑے مدلل انداز میں ان تمام طاقتوں اور فسطائی گروہوں کا بھی ذکر کیا۔ اس وقت اردو دشمنی کی آڑ لے کر عوام کے تہذیبی حقوق پر چھاپہ مار رہے ہیں۔ احسن کی تقریر بہت زور دار تھی، اور حاضرین پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا۔

اجلاس کے خاتمے پر پنڈت سندر لال جی نے احسن کی تقریر کا ذکر کیا اور کہا کہ ان کے خیال میں یہ تقریر کسی اشتراکی کی معلوم ہوتی تھی، اس پر حاضرین نے خوب زور و شور سے تالیاں بجائیں۔ پنڈت جی نے یہ بھی فرمایا کہ ہندستان میں ایک دوسرا انقلاب آ رہا ہے اور چین کی طرح یہ انقلاب بھی آ کے رہے گا اور اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ انھوں نے یہ ہمیں بتایا کہ پنڈت جواہر لال جی انھیں بہت عزیز ہیں، لیکن کیا کیا جائے۔ اب انھیں دلی کی گدی کسی مزدور کسان کے لئے خالی کرنی پڑے گی، آخر کے دس منٹوں میں پنڈت جی نے ہندوستان کے موجودہ حالات پر خالص مارکسی نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی جس سے سامعین کو بڑی حیرت اور مسرت ہوئی۔

اس جلسے میں حاضری کوئی دو یا ڈھائی ہزار کے قریب ہوگی۔ بھوپال کے وزیر اعظم صاحب بھی تشریف فرما تھے، اور انھوں نے بھی دس منٹ کے لئے بولنے کی اجازت چاہی، لیکن چونکہ یہ کانفرنس ادیبوں کی تھی، اور صرف ادیب ہی اس میں عملی حصہ لے سکتے تھے، اس لئے بحالت مجبوری انھیں یہ اجازت نہ مل سکی، دوسرے روز وزیر اعظم صاحب بھوپال نے ترقی پسند مصنفین کو ایک AT HOME کے لئے مدعو کیا۔ لیکن چونکہ ہم لوگوں کو علی الصباح وقت مزدور سبھا کا بلاوا آ چکا تھا، جسے ہم منظور کر چکے تھے۔ اس لئے ہم لوگ اس ایٹ ہوم کی سعادت سے بھی محروم رہ گئے۔

تیسرے روز کا جلسہ عصمت کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ اس روز ہال بالکل بھرا ہوا تھا۔ خواتین بھی تین چار سو کی تعداد میں شریک ہوں گی، عصمت کے خطبۂ صدارت کا موضوع "ادب اور فسادات" ہے، جس پر انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں بڑی بے باکی جرأت اور صاف گوئی بلکہ اکثر جگہوں پر تلخ نوائی سے کام لے کر روشنی ڈالی۔ فسادات اور ادب پر آج تک جو کچھ کہا گیا ہے۔ یہ مقالہ اس سے کہیں بہت آگے لے جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ بحث بہت صاف اور واضح ہوتی جا رہی ہے اور ادیب اور عوام بہت جلد اس مسئلے کے متعلق کوئی صحیح راستہ اختیار کر سکیں گے۔ عصمت کی شخصیت نے بھوپال کے عوام و خواتین کو بہت متاثر کیا۔ مجھے یاد ہے کہ اسی روز آٹھ دس لڑکیوں نے جرأت کر کے پردے کی رسم کو خیرباد کہا۔ اور چند دوسرے گھرانوں میں بھی جہاں مجھے جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں لڑکیاں اس مسئلے پر بڑی بے تابی اور بے چینی سے گفتگو کر رہی تھیں کہ وہ بھی عصمت کی طرح باہر میدان میں نکل کے اپنے آپ کو سماج کا آزاد اور ذمے دار شہری ثابت کریں گی۔ اور قدامت پسند ماں باپ سخت بوکھلائے ہوئے تھے۔

کانفرنس کے آخری روز سہ پہر کو مہندر ناتھ کی صدارت میں ایک اجلاس ہوا۔ مہندر ناتھ کا خطبۂ صدارت جس کے اہم موضوع پر ترقی پسندوں کے صحت مند نقطۂ نگاہ کی وضاحت کرتا ہے۔ مہندر ناتھ نے اپنے آپ پر تنقید کرتے ہوئے اور عصمت اور منٹو پر تنقید کرتے ہوئے اس غلط روایت کا اعتراف کیا۔ جسے اردو افسانہ نگاری میں ہم اور لحاف ایسے افسانوں نے پیدا کیا تھا۔ مہندر ناتھ نے یہ بھی بتایا کہ عصمت کس طرح اس روایت سے انحراف کر کے آگے بڑھی ہیں اور جن لوگوں نے اب تک اس روایت کو نہیں چھوڑا ہے۔ وہ کس طرح جنس کے متعلق حمیدہ اور گھناؤنے

جذبات کی پرورش کر رہے ہیں۔ مہندر ناتھ کے مقالے کے علاوہ اس اجلاس میں عادل رشید کا ایک طنزیہ مضمون اور احمد شاہ میرراہی کا ایک افسانہ بھی پڑھا گیا۔ یہ دونوں چیزیں بھی حاضرین نے بہت پسند کیں۔ بہ حیثیت مجموعی کانفرنس کے اس اجلاس میں ادبی اور علمی تفکر کا رنگ غالب رہا اور لوگوں نے بڑے اطمینان سے یہ سب چیزیں سنیں۔

اسی رات کو جوش صاحب کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ جس میں ترقی پسند شعرا اور غیر ترقی پسند شعرا بھی شامل تھے۔ جوش کی رباعیوں نے مجروح کی انقلابی غزلوں نے اور تاباں کی نظم "دیوالی" نے محفل کو گرما دیا اور اودھو کمار اودھو کی عوامی گیت "چرچل کی مجبوری" نے تو گویا شاعرہ لوٹ لیا۔ یہ گیت بار بار پڑھوایا گیا۔ اس سے پہلے بھی مجروح اور اودھو کمار اودھو سے کانفرنس کے ہر اجلاس میں عوام سننے کی فرمائش کرتے تھے، ان کی فرمائش کو پورا کرنا ہی پڑتا تھا۔ مجروح کی غزلوں کا نیا رنگ عوام کو بھا گیا۔ اور اودھو کمار اودھو کے گیت تو سبھی لوگوں کی زبان پر تھے، اور انھوں نے کانفرنس کے مقاصد کو عوام تک لے جانے میں ہماری بہت مدد کی۔

مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ لیکن ایک خامی کا میں بیان ضرور کروں گا، اور وہ یہ ہے کہ ترقی پسند شعرا اور غیر ترقی پسند شعرا کو ایک جگہ جمع کر دینے سے ہمارا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اور مشاعرے سے کوئی واضح شخصیت نہیں ابھرتی، ابھی ایک ترقی پسند نظم ہوئی۔ تو اس کے بعد دوسری نظم میں بالکل اس کے خلاف رجعت پسند خیالات کی اشاعت ہوتی ہے، پھر دو چیزیں ترقی پسندوں نے پیش کیں اور اس کے بعد تین چیزیں رجعت پسندوں نے دہرائیں۔ اس سے پورے مشاعرے میں فکری انتشار چھا جاتا ہے اور کوئی ایک واضح مقصد اور خیال اور تسلسل سننے والوں کے سامنے نہیں آتا۔ میرے خیال میں ہمیں اب اس قسم کی غلط سمجھوتے بازی کو ترک کر دینا چاہئے اور جس مقصد کو سامنے رکھ کے ہم اپنی کانفرنس کے دوسرے اجلاس منعقد کرتے ہیں اسی مقصد کو سامنے رکھ کے ہمیں مشاعرہ بھی کرنا چاہئے۔

اس مشاعرے میں جہاں چار پانچ ہزار کی حاضری تھی، ایک تجویز علی سردار جعفری کی گرفتاری کے متعلق بھی پاس ہوئی۔ جس پر احسن علی خاں نے بڑی اچھی تقریر کی۔ اور سارا ہال علی سردار جعفری زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا، عوام نے علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، اور نیاز حیدر کی غیر حاضری کو بار بار محسوس کیا۔ اور مجمع میں سے کئی بار لوگوں نے اصرار کیا کہ علی سردار جعفری کی ایک سے زیادہ چیزیں مشاعرے میں پڑھی جائیں اس سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ لوگ اپنے عوامی شاعروں سے کتنی محبت کرتے ہیں۔

مشاعرے کے ساتھ اس کانفرنس کا آخری اجلاس ختم ہو گیا۔ اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں بھوپال کے بھی ترقی پسند ادیب شامل ہیں۔ ان میں جاں نثار اختر کی انتھک کاوشیں ہیں جنھوں نے کانفرنس کے دوران میں ایک پل بھی چین نہیں لیا بلکہ دن رات کام کرتے رہے احسن علی خاں کی رفیقانہ سرگرمیاں جنھوں نے انجمن کے تمام عناصر کو ایک شیرازے میں مضبوطی سے باندھے رکھا۔ اختر سعید، اظہر سعید، قمر جمالی، صہبا لکھنوی اور دوسرے ادیب بھی ہیں جنھوں نے دن رات ایک کر کے اپنی محنت سے اس کانفرنس کو کامیاب بنایا ہے۔ خواتین میں بہن صفیہ اختر اور بہن اختر جمال اور عالیہ بہن کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے اپنی کاوشوں سے بھوپال کی خواتین تک ہمارے ترقی پسند ادب کی تحریک کو پہنچایا۔ بھوپال کی سب بہنوں نے جس خلوص سے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے کام کیا ہے اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اکثر رات کو گیارہ بارہ بجے کے بعد جب ہمارا اجلاس ختم ہوتا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ برقعہ پوش عورتیں، آٹھ آٹھ اور دس دس کی ٹولیوں میں۔ مائیں، بہنیں، بوڑھیاں بچیاں، اندھیری سڑک پر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی، سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی حمیدیہ کالج سے نکل کر شہر میں اپنے گھروں میں جا رہی ہیں۔ جو یہاں سے چار میل کے فاصلے پر ہے، ترقی پسند ادب کی تحریک کے لئے یقیناً یہ ایک ایسا منظر تھا۔ جسے بھلانا ممکن نہیں۔ ان پر خلوص محبت کا جواب ترقی پسند ادیب صرف اسی صورت میں دے سکتے

ہیں کہ وہ اپنی بہترین کاوشیں عوام کی بہبودی اور بہتری کے لئے صرف کر دیں۔

لیکن کیا ہم لوگ ایسا کر رہے ہیں۔ یہ ایک بہت مشکل سوال ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا سوال ہے جسے حل کئے بغیر اب ہماری تحریک آگے نہیں چل سکتی۔ یہ سوال مجھ سے بھوپال میں ہری تما نے کیا تھا۔ ہری تما بھوپال کا ایک جری مزدور ہے۔ جو ٹریڈ یونین تحریک سے وابستہ ہے۔ اس کا رنگ سانولا ہے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی لیکن بے حد تیز اور چمکیلی، اور ان میں ایک ایسا تجسس ہے جو آپ کی روح تک پہونچ جاتا ہے۔ گویا سب پردے ہٹا کے وہ اندر کی سچی صاف تصویر دیکھنا چاہتا ہے۔ ہری تما ہر روز ہی اس کانفرنس میں آتا رہا۔ جب کانفرنس ختم ہوگئی، تو میں نے اس سے پوچھا کہیں کانفرنس کیسی رہی، اس نے دو ایک لمحے میری طرف دیکھا۔ پھر کہا۔ کہو۔ تمہیں کیسی لگی، میں نے کہا "کانفرنس اچھی رہی" وہ بولا:۔ اس میں مزدور لوگ کم تھے، اب اگلی دفعہ تم آؤ گے تو ہم تمہیں مزدوروں کے یہاں لے چلیں گے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ تم لوگ ہمارے لئے ہم چھوٹے چھوٹے غریب آدمیوں کے لئے کم لکھتے ہو۔ میں نے کہا:۔ نہیں ہم تو تمہارے لئے ہی لکھتے ہیں۔ وہ بولا غلط ہے۔ تم لوگ اوپر بیٹھ کر ہمیں اوپر سے دیکھتے ہو۔ نیچے اتر کے ہم میں آکے لکھو، تو ہم بھی کچھ جانیں اور سمجھیں۔ میں نے پریشان ہو کے کہا۔ ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے، وہ بولا۔ بالکل ٹھیک ہے، میں اسی طرح تمہاری کانفرنس میں کہی جانے والی بہت سی باتیں نہیں سمجھا ہوں۔ اگر ہم دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھ کے ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دیں گے، تو آگے کیسے چلیں گے؟

میں نے پوچھا "تم اپنا مطلب سمجھا سکتے ہو؟" وہ بولا:۔ ادیب تم؟ مطلب مجھے بتانا پڑتا ہے، خیر سنو، تمہاری کانفرنس میں بڑی خوبصورت باتیں ہوئیں۔ بڑی بڑی خوبصورت باتیں۔ جیسے ہمارے کپڑے کے کارخانے میں سلک اور جارجٹ تیار ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت ہم مزدوروں کو سلک اور جارجٹ نہیں چاہئے۔ ہمیں تو مضبوط کپاس اور کھرا کپڑا چاہئے۔ جب ساری دنیا کے کارخانے ہمارے پاس ہو جائیں گے۔ پھر ہم بھی بہت سی سلک اور جارجٹ بنائیں گے۔ ابھی تو ہمیں اپنے مطلب کا کپڑا چاہئے، سو وہ تم دیتے نہیں ہو، باتیں بہت کرتے ہو، اصلی موقعے پر چپ ہو جاتے ہو۔

اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگیا۔ اس کی سچی بات آج میں آپ کے سامنے لایا ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں۔ ہری تما نے یہ سوال مجھ سے نہیں کیا ہے اس نے سارے ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں کو للکارا ہے، اور آپ سب کو نہایت سوچ سمجھ کے لیکن جلد ہی اس کا جواب دینا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ اس کا سوال بالکل صحیح ہے اور ہمارا جواب بھی بالکل صحیح ہونا چاہئے اور ہمارے ماضی کی شاندار روایات اور مستقبل کی توقعات کے مطابق ہونا چاہئے۔ ہم نے پچھلے برسوں میں بہت کام کیا ہے۔ مگر پہلے ہمارا راستہ بہت آسان تھا۔ اس وقت مقابلہ انگریز سے تھا۔ آج ہمارے مخالف محاذ پر ہمارے ہم وطن ہیں، اپنے ماں باپ ہیں۔ اپنے بہن بھائی ہیں، اپنے جگر گوشے ہیں۔ ان لوگوں سے لڑنا بہت مشکل ہے۔ لیکن یا تو ہمیں ان سے لڑنا ہوگا۔ اور یا پھر اپنے آپ کو مٹا دینا ہوگا۔ آج کہیں کوئی متحدہ محاذ نہیں ہے، آج لڑنے والا آگے بڑھنے والا محاذ ہے، جو مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ہے اور یہ محاذ اپنے ملک ہی میں سرمایہ دارانہ قوتوں سے برسرپیکار ہے۔ آج اس جنگ میں ہم کدھر ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب ترقی پسند تحریک، مسلم لیگی، کانگریسی، سوشلسٹ، کمیونسٹ دیانت دار ہندو، دیانت دار مسلمان، دیانت دار سکھ، انفرادی دہشت پسند، اجتماعی ریڈیکل، لبرل، آدھا لبرل، آدھا سوشلسٹ، آریہ سماجی، قادیانی، غیر قادیانی، مذہبی جنونی، لیکن انگریز دشمن، ہر قسم اور ہر قماش کے لوگوں کو اپنے دامن میں پناہ دیتی تھی، اور آج بھی دے رہی ہے آپ کی یہ اصلاح پسندی اس دور میں جائز ہو تو ہو، لیکن آج آپ کی اس اصلاح پسندی نے آپ کو اس منزل پر پہونچا دیا ہے۔ کہ آپ انقلابی قوتوں سے کٹ کے الگ کھڑے ہیں اور لڑنے والا طبقہ حیرت اور استعجاب سے آپ کی طرف دیکھ رہا ہے، اور اس کا نتیجہ آپ کے موجودہ ادب میں ظاہر ہے، ہم وحشی ہیں سے لے کر انسان مر گیا تک میں اس ہندوستان گیر المیے پر آپ کی اصلاح پسندی کی چھاپ ہے، اصلاح پسندی، ترقی پسندی نہیں، آپ کا افسانہ روبہ انحطاط ہے، وہ ایک اچھے انفرادی کاوشوں سے کیا ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر آپ کا افسانہ، نظم، تنقید، ڈرامہ، روبہ انحطاط ہے، اور اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس آزادی کے بعد ہم نے

صورت حال کا صحیح جائزہ نہیں لیا ہے، اور اپنے ادب میں لڑنے والی جمہور کو ابھرنے نہیں دیا ہے، آپ کے سامنے تلنگانہ ہوا، ملبار ہوا، تبھاگا ہوا، اہلیانر ہوا، کلکتہ ہوا، ہزاروں مدرسوں، مزدوروں، کلرکوں، ڈاک کے ملازموں ڈاک یارڈ کے محنت کشوں کی جنگیں ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ لیکن آپ کا مقام کہاں ہے۔ آپ کا زاویۂ نگاہ کس سمت کو گھوم رہا ہے، آج جہاں جہاں لڑنے والی جنتا کا لہو گر رہا ہے وہاں آپ کی مجرمانہ خاموشی اور بے حسی۔ ایک مجسم سوال بن کے تاریک ستون کی طرح کھڑی ہے، میں آپ سے بڑے وثوق سے کہتا ہوں، کہ ہماری ادبی تحریک میں گذشتہ دس بارہ سال سے ایسا نازک لمحہ نہیں آیا تھا۔ تاریخ اور وقت کا ہات ہمیں بہت جلد صحیح فیصلے کرنے کے لئے مجبور کر رہا ہے، اگر آپ لوگوں نے یہ فیصلہ نہیں کیا اور یہ تحریک اسی طرح رکی رہی تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ آپ کا بھی وہی حشر ہوگا۔ جو انگلستان میں سفید ہیں سوشلسٹ مصنفوں کا ہوا تھا۔ آپ کی اپنی صفوں سے فسطائی دوست پیدا ہوں گے، جو مارتزے کی طرح روح اور جسم کی غلاظت کو ادب میں اچھالیں گے۔ اور آپ کی نظموں میں ٹی۔ ایس۔ ریلیٹ کے اجاڑ ویرانے گھومیں گے، اور آپ کے چمکتے ہوئے تفکر کو موت کا زنگ کھا جائے گا۔ مجھ سے ایک روز علی سردار نے بڑے دکھ سے پوچھا تھا، کرشن کیا بات ہے، آج ہم میں کوئی ماما کوفسکی نہیں، کوئی گورکی نہیں، میں کہتا ہوں۔ اگر ہم، ماکوفسکی اور گورکی کی طرح کام نہیں کریں گے تو ہم میں ماما کوفسکی اور گورکی کیسے پیدا ہوں گے، اگر ہم ہاورڈ فاسٹ اور پبلو نرودا کی طرح انقلابی قوتوں کے دوش بدوش اپنی جان نہیں لڑائیں گے تو ہم میں ہاورڈ فاسٹ اور پبلو نرودا بھی کیسے پیدا ہوں گے، اور ہمارا ادب کس طرح دنیا کے عظیم ادب میں جگہ حاصل کر سکے گا۔ اور اپنے عوام کی محبت اسے کیسے حاصل ہوگی، اس وقت سوال یہ ہے کہ ہم لوگ اپنی موجودہ بے عملی بے حسی، اصلاح پسندی کو چھوڑ کر کس طرح اپنے ادب کو انقلابی قوتوں کا ساتھی بنا سکتے ہیں۔ یہ سوال ہے جو ہری ہمانے ہم سے پوچھا ہے۔ اور میں یہ سوال اپنی انجمن کے سامنے رکھتا ہوں جو ہم سب کی انجمن ہے۔

عصمت چغتائی

فسادات اور ادب

فسادات کا سیلاب اپنی پوری خباثتوں کے ساتھ آیا اور چلا گیا۔ مگر اپنے پیچھے زندہ مردہ اور سسکتی ہوئی لاشوں کے انبار چھوڑ گیا، ملک کے ہی دو ٹکڑے نہیں ہوئے۔ جسموں اور ذہنوں کا بھی بٹوارا ہو گیا۔ قدریں بکھر گئیں اور انسانیت کی دھجیاں اڑ گئیں، گورنمنٹ کے افسر دفتروں کے کلرک معہ میز کرسی قلم دوات اور رجسٹروں کے مال غنیمت کی طرح بانٹ دیئے گئے اور جو کچھ اس بٹوارے کے بعد بچے ان پر فسادات نے دست شفقت پھیر دیا۔ جن کے جسم سالم رہ گئے ان کے دلوں کے حصے بخرے ہو گئے، ایک بھائی ہندوستان کے حصہ میں آیا تو دوسرا پاکستان کے۔ ماں ہندوستان میں تو اولاد پاکستان میں۔ میاں ہندوستان میں تو بیوی پاکستان میں۔ خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ زندگی کے بندھن تار تار ہو گئے، یہاں تک کہ بہت سے جسم تو ہندوستان میں رہ گئے اور روح پاکستان چل دی۔

فسادات اور آزادی کچھ اس طرح گڈمڈ ہو کر وارد ہوئے کہ یہ قیاس لگانا دشوار ہو گیا کہ کون سی آزادی ہے اور کون سا فساد لہذا جس کے حصے میں آزادی آئی۔ فساد آگے پیچھے لائی۔ ایک بار ہی طوفان کچھ اس طرح بے کہے سنے وارد ہوا کہ لوگ بستر بوریہ بھی نہ سمیٹ سکے پر جب ذرا ٹھنڈک پڑی تو جملہ حواس جمع کر کے چاروں طرف دیکھنے کا موقع ملا۔

جب زندگی کا کونہ کونہ اس بھونچال کی عنایت سے لپٹ ہو چکا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ شاعر اور ادیب الگ تھلگ بیٹھے رہتے، جب زندگی خون میں غلطاں ہو گئی تو پھر ادب جس کا زندگی سے چولی دامن کا رشتہ ہے کہاں تک تر دامنی سے بچ سکتا تھا۔ لہذا ہجر و وصال کے جھگڑے بھول بھال کر لوگ ہڈی پسلی کے بچاؤ کی فکر میں پڑ گئے۔ شیطان کے چیلوں نے انداز، دو چار ہاتھ انداز معشوقانہ سے بھی آگے نکل گئے، پناہ گزینوں کے قافلوں نے قیس و فرہاد کی صحرا نوردی پر خاک ڈال دی، یہاں تک کہ غزل بھی جسے جاگیرداری کی ناز پروردہ کہا جاتا ہے۔ چوکڑی بھول کر کوچہ جاناں سے نکل بھاگی، اور جلتے ہوئے بازاروں۔ لٹے ہوئے مکانوں اور کچلی ہوئی انسانیت کے انباروں میں بھٹکنے لگی، اس کے سوا چارہ بھی تو نہ تھا۔ آخر غم جاناں کو ایک دن بڑھ کر غم دوراں ہونا تھا۔

جوں ہی ادیبوں اور شاعروں کے ہوش و حواس درست ہوئے اپنے مقصد کی طرف متوجہ ہو گئے، ان میں مختلف خیالات اور جذبات کے حامی نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند بھی اور رجعت پسند بھی اور وہ بھی جو نہ ترقی پسند ہیں نہ رجعت پسند، درمیان کا کوئی معمہ کچھ تو ان میں ایسے تھے جو گارا مٹی اور چونا لے کر فوراً لیپ پوت پر ڈٹ گئے۔

ٹوٹی دیواریں پھر سے اٹھائیں، ٹپکتی چھتوں پر مٹی ڈالی، مسمار ایوانوں کو نئے سرے سے سمیٹا ــــ یہ ہوئے وہ جن کی تخلیقات کا مقصد تعمیری تھا ــــ اس صف میں پیش پیش وہی نظر آتے ہیں جنھوں نے بدیسی راج کے سائے میں جنم لیا تھا۔ مگر اسی سایہ سے عرصہ ہوا اکتا چکے تھے جو اس بدیسی حکومت کے ہاتھوں نالاں اس کے جانے کی راہ دیکھ رہے تھے، اور جیسے ہی انھوں نے دیکھا کہ سفید چمڑی والے لٹیرے ہندوستان سے چلے گئے وہ ننھے بچوں کی طرح تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگے، آزادی کے نشہ نے انھیں ایسا مدہوش کر دیا کہ وہ سڑکوں پر ناچتے، گاتے، کودتے، اچھلتے، ذرا بھی تو نہ جھینپتے ذرا بھی تو نہ شرماتے اور شرمانے کی فرصت کسے تھی، یونین جیک نیچے پھسل رہا تھا، ترنگا اونچا ہو رہا تھا۔ اور وطن پرستوں کے دماغ ساتویں آسمان پر چڑھ

گئے۔ سینما میں جیسے جتی والے ہیرو کو گھوڑے پر آتا دیکھ کر سیٹیاں بجا بجا کر ناچتے ہیں بالکل اسی طرح یہ نشۂ آزادی کے متوالے ترنگے ہیرو کو عرش پر چڑھتا دیکھ کر گلی گلی کوچے کوچے ناچنے تھرکنے لگے۔

" جھوم جھوم کر ناچو، آج گاؤ من کے گیت " پریم دھون نے گایا۔

" بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے " جوش صاحب گرجے

" بڑے ناز سے آج ابھرا ہے سورج۔ ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے " جذبی نے بیتاب ہو کر کہا۔

" اے رود گنگا گیت گا۔ اٹھلا کے چل موج چمن۔

ہاں اے ہمالہ جھوم جا۔ رقصاں ہو اے کوہ و دمن

ہاں اے اجنتا کے بتو۔ نغمہ سرا ہو نغمہ زن

آزاد ہے آزاد ہے ہندوستاں " جاں نثار اختر نے جھوم کر کہا۔

میری دلی میری محبوب دلی

اب تو غاصب شہنشاہوں کی داشتہ اور خود کام جاگیرداروں کی لونڈی نہیں ہے

غیر ملکوں کے سرمایہ داروں کی منڈی نہیں ہے

تو ہماری امیدوں کا مرکز ہے خوابوں کی تعبیر ہے

آرزؤں کی تصویر ہے

ترے چہرے پہ میں آج ایک نور سا دیکھتا ہوں . . . . جعفری نے للکارا

لیکن ۱۵ اگست بھی آیا تو ٹھہرنے کے لئے نہیں جانے کے لئے۔ اور اپنے پیچھے کھسیانے، روہانسے، اور منہ بسورتے ہوئے انسانوں کا سیلاب چھوڑ گیا۔ گاتے دل خاموش ہو گئے، ناچتے پیر تھم گئے جو رقصاں بھی رہے وہ نہ جانے کس تال سر کے بل بوتے پہ جلے ہوئے دل سوچنے لگے۔ سوچنے لگے اور سمجھنے لگے۔ معلوم ہوا یار لوگ اپنی کا چاند پکڑ لائے جل دیئے جس کا ملمع اتنا کچا کہ دو دن نہ ٹھہر سکا جسے صبح صادق جانا وہ صرف ایک بتاشہ تھا جس کی عارضی روشنی میں بھولے دل ایک دم جھوم اٹھے تھے۔ جانے والے کس چالاکی سے گئے، کہ جسم لے گئے روح چھوڑ گئے اور ستم ظریفی دیکھئے کہ آزادی کے دو ٹکڑے کر کے پکڑا گئے۔ کہنے کو کہدیا کہ ہندوستان ہندستانیوں کو پاکستان پاکستانیوں کو دیے گئے۔ جب حساب کتاب کیا تو یہ پتا چلا جو کچھ ملا ہندستان کے سرمایہ داروں اور پاکستان کے جاگیرداروں کو ملا۔ جو ہاتھ پہلے خالی تھے وہ اب بھی خالی ہیں اندھے بانٹیں ریوڑیاں، اپنوں ہی کو دیتا چلا گیا۔ چنانچہ جوش صاحب بپھر کر بولے۔

یہ بیونت یہ کترنا۔ یہ کانٹ چھانٹ ابتری، شناوروں کی ڈبکیاں مجاہدوں کی بے پری

"خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے"

اور سردار جعفری نے دانت پیس کر کہا :-

کون آزاد ہوا ؟

کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی ؟

میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا

مادرِ ہند کے چہرے پہ اداسی ہے وہی
خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لئے
موت آزاد ہے لاشوں پہ گذرنے کے لئے
اور مجازؔ نے چپکے سے کہا ——

یہ سب خون میں ہاتھ ہیں جن کے تر ۔ یہی تھے مسیحا یہی تھے خضر

ادھر سے احمد ندیم قاسمی نے اطلاع دی کہ یہاں بھی خیریت نہیں۔

روٹیاں بوٹیوں سے تلتی ہیں ۔ عصمتوں کی سبھی دوکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے ۔ خون کا ذائقہ زبانوں پر

اور مجروحؔ نے چڑھ کر کہا

اب وہ غمِ زنداں دیتے ہیں۔ جن کو غمِ زنداں ہونا تھا۔

اور اخترؔ نے بسور کر کہا:۔

میں تو یوں خوش تھا کہ آزاد ہوا میرا وطن ۔ ۔ ۔ ۔ مگر انھیں جلد ہی معلوم ہو گیا۔

کہ ہاتھ لگتے ہی تو رنگِ گل تر چھوٹ گیا ۔ ہار گندھنے بھی نہ پایا تھا ابھی ٹوٹ گیا
جام لب تک بھی نہ آیا تھا ابھی پھوٹ گیا ۔ میرے خوابوں کو نہیں کوئی مجھے لوٹ گیا

غرض ہر طرف سے لے دے شروع ہو گئی لیکن۔ اس سے قبل کہ جواب وہی کی طلب زور پکڑے ایک دم سے فسادات کا دھاوا پوری طاقت سے سر پہ چھوڑ دیا گیا۔ صاف ظاہر ہے کہ حقیقت کی طلبی سے دھیان ہٹا کر پہلے فسادات کی روک تھام ضروری سمجھی گئی۔ ہندستان اور پاکستان کے بیشتر ترقی پسند ادیب فوراً اس طرف متوجہ ہو گئے، اور دوسرے ترقی پسند عناصر کی ہمراہی میں کام شروع کر دیا گیا۔ چاقو اور چھری کا وار قلم پہ روکا گیا۔ گو رجعت پسندوں نے چاقو چھری ہی کا ساتھ دیا مگر فتح ترقی پسند عناصر کی ہوئی، یہ ایسا وقت تھا جب جان کی قیمت ایک مٹھی ریت ہو گئی تھی، شرنارتھیوں کی بیکسی فوج کو نہتا میدان میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہر مطالبہ کے جواب میں فساد کی آگ دونی بھڑکا دی جاتی تھی اگر لوگ اگر دو چار بیٹھ موڑے کھڑے تھے۔ مصلح قوم نہ جانے کہاں اونگھ رہے تھے، اس وقت ادیبوں نے بالکل اسلحہ جات کی طرح ڈرامے اسکیچز اور نظمیں تیار کر کے تیزی سے فضا میں بکھیر دیں، احمد عباس نے اپنا ڈرامہ "میں کون ہوں" ڈیڑھ گھنٹہ میں بیٹھ کر گھسیٹ ڈالا، ریہرسل کیا اور اسی شام شہر کے کئی حصوں میں اسے پھیلا دیا گیا۔ اس وقت عباس کے پاس یہ سوچنے کی مہلت نہ تھی کہ اس جلد بازی سے فن کو ٹھیس نہ لگ جائے اس کے قلم کی ہتک نہ ہو جائے۔ ایک ادیب کی عظمت میں فرق نہ آ جائے۔ اور اگر وہ یہ سب کچھ سوچ لیتے تو شاید "میں کون ہوں" فن کا بہت کچھ مرقع بنا لیتے۔ مگر وہ اس آگ کے لئے چھینٹا نہ بن سکتا جو اس وقت بھڑک رہی تھی، اس بھڑکتی ہوئی دنیا کو شہ پاروں سے زیادہ چھینٹوں کی ضرورت ہے۔

اسی زمانہ میں کرشن چندر نے باقاعدہ ایک مضبوط مورچہ قائم کر کے افسانوں، کہانیوں اور اسکیچز کی ایک فوج کی فوج میدان میں اتار دی جس تیزی سے فساد پھیلے اسی تیزی سے کرشن کے افسانے ہندوستان اور پاکستان کے رسالوں کے ذریعہ پھیل گئے، قصداً یا شاید انجانے طور پر یہ بمباری کچھ اس انداز سے کی گئی، کہ دنیا میں کہیں اور ایسی کوئی دوسری مثال نہ ملے گی، کہ ایک ہی ادیب نے دوا کی خوراکوں

کی طرح اس مختصر سے عرصہ میں اتنا کچھ لکھا ہو۔ اور نسخہ مفید ثابت ہوا ہو۔

کرشن نے جو کچھ لکھا۔ جذبات کی رو سے بچ کر سمجھ بوجھ کر اور شاید زبردستی لکھا، آمد کا گلا گھونٹ کر آورد کو لبیک کہا۔ وہی لکھا جو اس نے لکھنا چاہا۔ جو مصلحت وقت نے کہا:۔

یہ وہ وقت تھا جب دونوں فرقے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو چکے تھے، ابھی گنتی تو ہوئی نہیں جو یہ پتہ چلے کہ کس پارٹی نے زیادہ شکار کئے۔ اگر مسلمانوں نے دو ہزار برہنہ عورتوں کے جلوس نکالے تو ہندوؤں نے چار ہزار۔

مسلمانوں نے چھ ہزار

ہندوؤں نے آٹھ ہزار —— آٹھ ہزار، سولہ ہزار، بتیس ہزار، سو ہزار، اب کوئی نیک بخت عقلمند ہوتا تو گن کر بتا دیتا کہ جیت کس پارٹی کے سورماؤں کو نصیب ہوئی۔ ویسے تو ہر جیتا ہوا شکست خوردہ سے بدتر نظر آتا ہے سب ہی کے سر ندامت سے جھکے ہوئے ہیں ایسی حالت میں جو کچھ کرشن چندر، احمد عباس، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، اشک، ساحر لدھیانوی، ہاجرہ مسرور اور اسی برادری کے دوسرے لکھنے والوں نے لکھا اسے عزیز احمد، حسن عسکری اور ایم اسلم ادب ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان لوگوں نے ترازو میں تول تول کر ہر وحشی کو برابر کا حصہ دیا ہے حالانکہ ان کا خیال ہے کہ ظلم صرف ہندوؤں اور سکھوں نے کئے ہیں۔ پتہ نہیں وہ کس بنا پر ایسا کہتے ہیں۔ شاید ظالموں نے حساب کتاب کا رجسٹر ان کی خدمت میں پہونچا دیا ہے۔ ورنہ ہر عقل رکھنے والا اندازہ سے ہی کہہ سکتا ہے کہ ظلم دونوں فرقوں نے کئے اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کئے۔ ان کی رائے میں یک طرفہ تصویر ہی صحیح حالات کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر کرشن چندر کو بھی وہی کچھ لکھنا چاہیئے تھا جو اس کی آنکھوں نے دیکھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو کیا ہوتا۔ اس زمانے میں جب کہ کرشن نے یہ افسانے لکھے اس کا گھر شرنارتھی کیمپ بنا ہوا تھا۔ مغربی پنجاب کے لٹے لٹائے ذہنی اور جسمانی زخمی اور ان کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ کر کون جانے کرشن کے دل میں مسلمانوں کے خلاف کتنا شدید جذبہ اٹھا ہوگا۔ کسے معلوم ان خانہ برباد عزیزوں اور پیاروں میں بیٹھ کر اس کی حقیقت بیں آنکھوں پر کتنی اندھیری چادر پڑ گئی ہوگی۔ مگر وہ کونسا جذبہ اور کونسی طاقت تھی جس کی مدد سے اس نے اس چادر کو چاک کر کے باہر جھانکا۔ کئی بار یہ محسوس کر کے کہ وہ متعصب ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اس فضا سے بھاگ نکلا ہوگا۔ تاکہ ان دکھیوں کی آہوں کی گرمی سے دور ہٹ کر تصویر کے دوسرے رخ کو اپنی تخیل کی نگاہ سے جنم دے ڈھونڈ ڈھونڈھ کر ایسی تصویریں چنیں یا تخلیق کیں۔ جن کی نمائش کے وقت ترازو کے دونوں پلڑے برابر رہیں۔ اور اس وقت ہر شخص جسے اپنے ملک سے پیار تھا۔ یہی کرتا جو کرشن نے کیا۔ ترازو اٹھا کر ایک پلڑے میں چشم دید واقعات اور بیتے ہوئے حالات رکھے دوسرے میں تخیل کے کھینچے ہوئے نقشے۔ کوئی اور ہوتا تو ڈنڈی مار جاتا یا ایم اسلم کی طرح ایک ہی پلڑے کی ترازو بیتا۔ یا بقول عسکری صاحب نہ ظالم کو ظالم کہتا، نہ ظلم کی مذمت کرتا۔ نہ بدی کو روکنا پسند کرتا اور چند احمقانہ لطیفے لکھ کر اسی انتظار میں بیٹھ جاتا کہ انسان کی نیکی جو بدی کے ساتھ ساتھ ضرور ہوتی ہے کب تہہ سے اچھلے اور سطح پر آئے، اور پھر اسے غیر فانی تخلیقی ادب کا رتبہ دے کر خراج تحسین کی امید کرتا۔ میرے خیال میں خواہ کرشن چندر نے ادب کا گلا گھونٹا۔ فن کی نزاکتوں کو کچلا، مصنوعی ادب کو جنم دیا مگر وہ اپنے فرض سے غافل نہیں رہا۔ اس نے پروپگنڈا کیا اور مصلح بن بیٹھا۔ اس وقت جب کہ ہمیں فنکار سے زیادہ رہنما کی ضرورت تھی، اس نے وہی کیا۔ جس کی ضرورت تھی، مصلحت تھی، حسن عسکری کی نظروں میں مصلح احمق ہوں گے۔ چونکہ وہ خود مصلح بننے کی کوشش میں یہ سب کچھ ثابت کئے دے رہے ہیں۔ ہمیں حسن عسکری کی قدروں سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمارے سامنے ان مٹ قدریں موجود ہیں۔ ہم انھیں پر نظر رکھیں گے۔

باوجود ان سب باتوں کے کرشن چندر اور دوسرے کئی لکھنے والوں نے جو کچھ بھی فسادات کے بارے میں لکھا وہ ادبی نقطہ نظر سے کسی طرح بھی نیچا نہیں "ہم وحشی ہیں" کا طرز بیان، پلاٹ اور پرواز تخیل کے معاملہ میں خود کرشن کے گذشتہ مجموعوں پر بھاری ہے۔ وہ سوز و گداز

وہ جیمن جو یہاں سے فطاروں میں نہ تھی، شکست میں بھی نہ تھی غرض سوائے "ان داتا" کے کہیں بھی نہ تھی، حال ہی میں جو کرشن کی تحریروں میں آتش فشانی سنعت پیدا ہوئی ہے، وہ صرف اس وجہ سے کہ ان تحریروں میں ایک لگن ہے، ایک مقصد ہے، ایک ارادہ ہے اور اس کی تکمیل ہے اور یہی چیز ہے جس نے اسے اتنے بلند مرتبہ پر پہونچا دیا ہے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو سینہ کوٹ کوٹ کر فرقہ وارانہ ماتم کر رہے ہیں اور اپنی اس حرکت سے فسطائی طاقتوں کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔ یہ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے پٹھو عوام دشمن اور موقع پرست ہیں ملک کے بٹوارے کے وقت جو مال غنیمت ان کے ہاتھ آیا ہے اس کی حفاظت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، ملک کے ٹکڑے ہوتے وقت جو کچھ ان کے ہاتھ لگا وہ عوام شاید ان کے حلق سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اس لئے فرقہ داری کا ڈھونگ رچا کر ان کا دھیان بٹانا چاہتے ہیں۔ یہ انگریزوں کے تربیت دئے ہوئے ان کے جانشین ہیں جب کبھی ہندستانیوں نے آزاد ہونے کی خواہش ظاہر کی اور فساد شروع کرادئے گئے اور اب انگریز چلے گئے (جسمانی طور پر) تو ان گدی پانے والوں کو اس نام نہاد آزادی کا پول کھلتا نظر آیا۔ ان کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ رہا کہ مذہب کی آڑ لے کر ملک کا بٹوارہ کر ڈالیں نیز مرے پر سو دُرّے آپس میں ایسے خون خرابے کرا دیں کہ ایک عرصہ کے لئے متحدہ محاذ کا ڈر دور ہوجائے اور اس بٹوارے کو قائم رکھنے کے لئے ابدی مخاصمت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ انھیں اصولوں کو مدنظر رکھ کر ایم اسلم نے رقص ابلیس کی تخلیق فرمائی

لیکن رجعت پرستی کے علاوہ اس ناول میں نہ دم ہے نہ دلچسپی۔ انداز بیان نہایت بچکانہ اور پھس پھسا۔ کسی ایک بھی واقعہ پر اصلیت کا دھوکا نہیں ہوتا کیونکہ شروع سے آخر تک ایک واقعہ بھی موثر طریقے سے نہیں پیش کیا گیا۔ کردار نہایت بوسیدہ اور بھونڈے ہیں ساری ناول میں بس دو احمق قسم کے آدمی لوٹے پھوٹے مکالموں کے ذریعہ سستی منائی اڑاتے ہیں۔ وہ بھی اتنی روکھی پھیکی طرح کہ جی اکتانے لگتا ہے، کتاب کا ہیرو یعنی محبوب الٰہی جو مشرقی پنجاب میں سب کچھ لٹا کر ماں کو اپنے ہاتھوں سے دفن کرکے آیا ہے۔ جس کی ایک شب بیاہی دلہن کو سکھ اٹھالے گئے ہیں نہایت مزے سے چائے وچوبند صاف بستر، باقر خانیوں اور شکر وغیرہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے لیکن آخر میں اس کی اغوا شدہ دلہن اسٹنٹ کوئین کی ہیروئن کی طرح سب کو مارتی پچھاڑتی صحیح وسالم بالکل پاک دامن لوٹ آتی ہے، پورے ناول میں ایک فرقہ کی طرف سے دوسرے فرقہ کی سات پیڑھیوں کو کوسا ہے اور گالیاں دی ہیں۔

اگر کوئی دوسرا! اس ناول کو اسی نظریہ کے ماتحت لکھتا جس کا زور قلم ایم۔ اسلم سے زیادہ ہوتا۔ تو واقعی یہ ناول خطرناک ہو سکتی تھی لیکن یہاں تو اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں۔

خیر ناول کو چھوڑئے اصل چیز تو اس کا دیباچہ ہے جو حسن عسکری صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے، پہلے ہی صفحہ کو پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس ناول میں کیا کچھ ہے اور کس بھدے طریقے سے ہے۔ ایم۔ اسلم، حسن عسکری اور شاید عزیز احمد کے سوا پاکستان میں کسی ادیب نے خواہ وہ ترقی پسند ہے یا نہیں رقص ابلیس کو نہیں سراہا، اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ رجعت پسندوں کا محاذ ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں مضبوط نہیں۔

ایم۔ اسلم کی چوٹ پر رامانند ساگر نے بھی ایک ناول "اور انسان مرگیا" لکھا۔ یہ دونوں ناول میں نے ایک ہی وقت میں دیکھے تکنک کو چھوڑ کر جہاں تک مواد اور نظریہ کا سوال ہے۔ دونوں میں بڑی قریب کی مشابہت ہے۔ رامانند ساگر ترقی پسند نہیں تو رجعت پسند بھی نہ تھے انھیں ایم اسلم کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا کرتے مجھے بالکل ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے کہ میں خود وہاں جا کھڑی ہوئی ہوں، کیونکہ رامانند کو میں نے ہمیشہ اپنی برادری کا ایک فرد گردانا اور یہاں انھیں اور ایم اسلم کو ہم خیال دیکھ کر دکھ ہوا

مثلاً رقص ابلیس میں ایم اسلم نے یہ دکھ بیان کئے ہیں جو سکھوں اور ہندؤں نے مسلمانوں پر کئے ۔
" اور انسان مرگیا میں " رامانند ساگر نے وہ دکھ بیان کئے ہیں جو ہندؤں اور سکھوں پر مسلمان نے کئے ہیں ۔

ایم اسلم کے یہاں بھی ایک سکھ موجود ہے جو مسلمانوں کی جان بچانے کو اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے
رامانند ساگر کو بھی ایک مسلمان مولانا مل گئے جو یہی خدمات انجام دیتے ہیں
ایم اسلم کی ہیروئن کو سکھ اٹھائے جاتے ہیں
راماند کی ہیروئن کو مسلمان

مگر یہاں ایم اسلم نے راماند ساگر سے زیادہ ترقی پسندی کا ثبوت دیا ہے ۔ جب ان کی ہیروئن خورشید پاکستان لوٹ آتی ہے تو اس کا شوہر اسے بغیر صفائی ہی کے قبول کرنے کو تیار ہو چکا تھا ۔

راماند ساگر کی ہیروئن جب لٹ لٹا کر بیٹھتی ہے تو وہ احمق ہیرو کی سرد مہری سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لیتی ہے راماند ساگر ایک گری ہوئی عورت کو اٹھانے میں جھجک گئے ،

ایم اسلم کے یہاں خاتمہ بخیر ہے مستقبل ان کے اپنے خیال کے مطابق روشن ہے ،
راماندساگر کے یہاں یاسیت ہے حماقت کی حد کو پہونچی ہوئی ناامیدی ہے
ایم اسلم کے کردار بچے کھچے جو رہ گئے ہیں وہ نئی زندگی شروع کر دیتے ہیں ۔

راماندساگر کے کردار ذہنی اخلاقی اور جسمانی خودکشی کر لیتے ہیں ، پاگل ہو کر لوگوں کو کاٹنے دوڑتے ہیں ۔ اور اسی بر تے پہ ہمدردی کے امیدوار نظر آتے ہیں ۔ ان باتوں کے علاوہ رقص ابلیس کا دیباچہ حسن عسکری نے لکھا ہے ۔

" اور انسان مرگیا " کا دیباچہ احمد عباس نے لکھا ہے ، اور اس میدان میں احمد عباس نے عسکری کی رجعت پسندی پر سبقت لے جانے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔

عسکری صاحب فرماتے ہیں " رقص ابلیس " ہی تخلیقی اور تعمیری ادب ہے
احمد عباس کہتے ہیں اندھیرے میں انھیں ایک ستارہ نظر آیا اور وہ راماند ساگر تھا ۔ کیونکہ وہ سوچتا ہے انسان مرگیا یہی انسان کے نہ مرنے کا ثبوت ہے ۔

پتہ نہیں یہ کس قسم کا فلسفہ ہے ۔ شاید راماند ساگر اور احمد عباس ہی کی سمجھ میں آیا ہو کہ یاسیت ہی اصل رجائیت ہے جب راماند ساگر نے اپنے ناول میں ہر انسان اور حیوان کو مار ڈالا تو عباس قائل ہو گئے کہ موت ہی اصل زندگی ہے باقی سب حماقت ہے ۔

عسکری صاحب فرماتے ہیں فسادات کے اصل ذمہ دار سکھ ہیں ۔ اور ہندو مسلمان بیچارے تو صرف اپنے بچاؤ کے لئے کبھی کبھی مار بیٹھتے ہیں ۔

احمد عباس کا خیال ہے کہ عوام ہی فساد کے ذمہ دار اور بانی ہیں انھوں نے شوقیہ ایک دوسرے کا گلا کاٹا ، اور وہ بدیسی حکمرانوں ، اور سامراج کے سالہاسال کے کئے دھرے پر پانی پھیرے دیتے ہیں ۔ وہ یہی سوچتے ہوں گے کہ اس تقسیم کے ذمہ دار عوام ہی نے پاکستان مانگا تھا اور انھیں کو مل گیا ۔

پاکستان اور ہندستان کے اس قسم کے لوگ اپنی ایسی تحریروں سے اس طبقہ کی پردہ پوشی کرنا چاہتے ہیں جو ذاتی مفاد

کی خاطر اس بٹوارے اور فسادات کا اصلی بانی ہے، یہ طبقہ کسی ایک ملک کی ملکیت نہیں بلکہ چند ملکوں کے سوا ہر حصہ زمین پر اس کے پنجے گڑے ہوئے ہیں اور اسی قسم کی حرکتیں کرکے اسی قسم کے بہانے اور حماقتیں ڈھونڈ رہا ہے۔

مگر ہمیں خوفزدہ یا ناامید نہ ہونا چاہئے۔ اس قسم کے ادب کو نہ ہی عوام نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور نہ ہی اپنایا ہے ممکن ہے وقتی طور پر عوام بہک جائیں مگر ان ڈھول تاشوں سے انھیں زیادہ دن نہیں بہلایا جا سکتا۔

اس تعمیری اور تخریبی ادب کے درمیان اور کڑیاں بھی ہیں جن میں سے ایک تو وہ ہے جس کا اظہار ممتاز شیریں کے افسانہ بھارت ناٹیہ میں کیا ہے۔ اس افسانہ کا لب لباب یہ ہے کہ بھارت ماتا کے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ خوب ہوا، پہلے تو اسے ذرا سی تکلیف ہوئی، مگر پھر وہ قائل ہو گئی کہ جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ یہاں انھوں نے ہندستان کو ایک ماں بنا کر لفظ ماں کو کیچڑ میں اوندھے منہ گرا دیا ہے۔ بھلا ایسی بھی دنیا میں کوئی ماں ہوگی جس کا بچہ چیر کر دو ٹکڑے کر ڈالا گیا تو وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگی کہ آہاہا دو دو ہو گئے۔ میرے دونوں بیٹے، یہ مثال نہایت بھونڈی اور بھیانک ہے۔ محترمہ سے میری درخواست ہے کہ اگر وہ خود ماں ہیں تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ بچے کے بارے میں ان کا اتنا مضحکہ خیز نظریہ ہے، اور جو وہ اس جھمیلے سے آزاد ہیں۔ پھر بھی کم سے کم وہ عورت تو ہیں جو ماں اور بچے کے رشتہ کی ایسی تضحیک کبھی برداشت نہیں کر سکتی اور اس کی درگت نہ بنائے گی۔ یہ نظریہ ویسے بھی بغیر اس مثال کے کچھ بے تکا سا ہے کہ اگر ایک چیز کے دو ٹکڑے ہو جائیں تو وہ زیادہ پھلے پھولے گی، سالم نہ پھل سکے گی۔ محترمہ ایک نہایت خوفناک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ تقسیم کر دینے سے ممکن ہے دہارے کا زور دھیما پڑ جائے لیکن اگر اتفاق سے یہ دو ٹکڑے مل گئے تو پھر اس سیلاب کو کسی قسم کی روک تھام اور پیش بندی نہ روک سکے گی، وہ جرأتیں جو اس بٹوارے سے کمزور پڑ گئی ہیں اگر متحد ہو گئیں تو پھر کیا ہوگا۔ انھوں نے نہیں سوچا۔ مگر یہ میری غلطی ہے وہ خوب سوچ سمجھ کر باقاعدہ پروگرام کے مطابق یہ سب کچھ کہہ رہی ہیں۔ گو یہ بڑے مصنوعی حربے ثابت ہوں گے۔ مگر فی الحال تو یہ ادب تخریبی ادب سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔ تخریبی ادب کا مقصد تو صرف توڑ پھوڑ ہے مگر یہ ادب پیڑ کی جڑ کو کھوکھلا کرکے اس میں نیا بیج ڈالنے کی سازش ہے۔ اگر یہ بیج جڑ پکڑ جائے تو انسان کو جھوٹی امید اور کھوکھلے وعدوں کے چکر میں پھنسا کر قوت ارادی کو کچل دیتا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ منٹو کے "سیاہ حاشئے" ادب پاروں کی فہرست میں شامل کروں یا ان کے لئے کوئی نئی جگہ تلاش کروں۔ منٹو کو عجیب و غریب تہلکہ ڈال دینے والی، اور سوتوں کو چونکا دینے والی چیزوں سے بڑی رغبت ہے وہ سوچتا ہے کہ اگر بہت سے لوگ سفید کپڑے پہنے بیٹھے ہوں اور کوئی کیچڑ مل کر وہاں چلا جائے تو سب ہکا بکا رہ جائیں گے، سب لوگ رو پیٹ رہے ہوں، وہاں ایک اونچا قہقہہ لگا دو تو سب دم سادھ کر ٹکر ٹکر منہ دیکھنے لگیں گے، بس دھاک بیٹھ جائے گی، سکہ جم جائے گا۔ اس حربہ کے ذریعہ سے منٹو نے بہت دفعہ لوگوں سے خراج وصول کیا ہے مگر اس دفعہ اس کا وار کچھ اوچھا پڑا، ویسے سیاہ حاشیہ ادبی شہ پارے اور غیر فانی عجوبے نہیں تو بالکل کوڑا کباڑ بھی نہیں۔ ان میں سے بہت سے ٹکڑے خوبصورت ہیں کہ پڑھ کر جی بھر آتا ہے۔ لیکن دیباچہ نویس نے ان کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ انھیں غلط لباس میں پیش کیا ہے۔ لباس اپنی طرف سے منڈھ دیا ہے۔ یہ کہہ کر کہ منٹو ظالم کو ظالم نہیں کہتا، نہ جانے ان کا کیا مطلب ہے، کیا وہ سوچتے ہیں منٹو ظالم کو محبوب یا دلبر کہتا ہے، میرے خیال میں منٹو کبھی اس قسم کی باتیں نہیں کہتا، وہ سب کچھ کہہ سکتا ہے یہ نہیں کہہ سکتا کہ شیطان طبع لوگ خود اپنی جدت ہیں یا خدا نے انھیں ایسا ہی بنایا ہے معاشی اور اقتصادی، اور سیاسی طاقتوں کا اس تعمیر میں ہاتھ نہیں۔ عسکری صاحب کا فلسفہ ہے کہ مارنے والوں کو منع نہ کرو، وہ نہ مانیں گے تو کیا ان کی رائے ہے کوئی سر پر ایک لٹھ مارے تو اس سے کہیں گے، بھائی چار اور مارے۔ یہ مقدس جذبہ عسکری صاحب میں ہو تو ہو کسی عقلمند انسان میں تو نہیں اور منٹو میں تو ہرگز نہیں، منٹو تو ایک بار سمجھائے گا، دو بار سمجھائے گا۔ تیسری بار اگر لاتوں کے بھوت

باتوں سے نہ مانے تو لاتوں ہی سے سمجھائے گا۔ عسکری صاحب نے منٹو کا نظریہ مسخ کر کے پیش کرنے میں نہ جانے کیا لذت محسوس کی۔ مگر یہ ہوا برا منٹو کے لئے۔ منٹو سب کچھ ہو سکتا ہے متعصب نہیں ہو سکتا۔ کسی کے بنائے بھی نہ بنے گا۔ فسادپسند نہ بنے گا۔ وہ انسان جو دنیا کی ذلیل ترین ٹھکرائی ہوئی طوائف کے لئے اپنے قیمتی آنسو بہا سکتا ہے جو دلال جیسے رذیل حیوان کے دل کو ٹٹول سکتا ہے جس کی حساس ناک عطر کی خوشبو کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ صرف اس لئے کہ اس خوشبو میں تصنع ہے، بناوٹ ہے فریب ہے، وہ لاشوں پر قہقہہ لگا کر نہیں اچھل کود سکتا۔ وہ ظالم کو ظالم کہنے سے بھی نہیں ڈر سکتا، اور فساد کو روکنے کیوں جھجکے گا ہمیں کہیں دھوکا ہوا ہے، ہماری آنکھوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کسی پوشیدہ مطلب کی خاطر منٹو کی تحریر کو آلۂ کار بنایا گیا ہے، منٹو کا طرز تحریر کبھی کبھی الجھا ہوا ہوتا ہے۔ وہ گھما کر کہنے کا عادی ہے مگر اتنا معلوم ہے کہ بیاہ حاشئے منٹو نے ہنس کر نہیں لکھے اور ہنسانے کے لئے نہیں لکھے اور نہ ہی کبھی وہ رجعت پسند ادب لکھے گا۔ خواہ اس کو کتنے ہی جھانسے دئے جائیں

یہ ہے اس ادب کی ایک جھلک جس نے فساد کے بھیانک زہر جنم لیا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس میں سے کیا کچھ غیر فانی بنتا ہے، اور کیا کچھ عطار کی دکان پر پڑیاں باندھنے کے کام میں آتا ہے۔ یہ کہہ دینا یہ سب ہنگامی ادب ہے اور اس ہنگامے کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت اور مقبولیت ختم ہو جائے گی غلط ہے، ہر زمانہ کا ادب ہنگامی ہوتا ہے، مولانا حالی نے بھی وقت ہنگامہ جو کچھ لکھا وہ غیر فانی صورت اختیار کر چکا ہے گورکی کی تحریریں کبھی ماند نہ پڑیں گی۔ حالانکہ جس ہنگامہ کے سلسلہ میں اس نے لکھا وہ اس کے ملک میں ختم ہو گیا۔ مگر اس کا ایک ایک حرف اب بھی لوگ سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ تمام جو غلامی کی کریہہ رسم پر لکھا گیا، ہنگامی ہوتے ہوئے بھی لافانی بن گیا۔ سپین کی بغاوت ختم ہو گئی، الیکن FOR WHOM THE BELL TOLLS کی عظمت قائم ہے،

لہٰذا وہ لوگ جو فسادات پر لکھے ہوئے ادب کو ہنگامی ادب اور وقتی پروپگنڈہ کہہ کر اس کی وقعت کم کرنا چاہتے ہیں وہ زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو خود کچھ نہ لکھ سکے یا شاید اس ادب کو اپنے مطلب کے خلاف پا کر اسے گمنامی سے ڈرا کر میدان صاف کرنا چاہتے ہیں۔ ادب کی فنا اور بقا، نفس مضمون اور ادیب کی صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ اس ادب کو وقتی ادب کہنا تنگ نظری کی دلیل ہے۔

اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہر ہنگامہ غیر فانی ادب پیدا کر سکتا ہے، مثلاً اگر کسی نواب صاحب کے لاڈلے کتے کی شادی پر سہرا لکھا جائے یا کسی کلکٹر صاحب کے تبادلہ پر شہر کے ہیڈ ماسٹر صاحب الوداعی مرثیہ لکھ دیں تو وہ بھی غیر فانی ہو جائے گا۔ غیر فانی ادب کو پیدا کرنے کے لئے ایک حساس دل کی ضرورت ہے اس طرف جہاں کی کوئی منزل ہو۔ ورنہ بقول شاعر ؂

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

انور انصاری

اردو تنقید اور طبقاتی شعور

اردو تنقید پر نظر ڈالتے وقت یہ سوال قدرتاً پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہمارے نقادوں کے تنقیدی اصول کیا رہے ہیں اور ہوں گے۔ یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اسی پر تنقیدی کارناموں کی وقعت، صحت مندی اور افادیت کا دار و مدار ہے۔

اس سلسلے میں سوال مذکور ایک نیا اور اس سے زیادہ ضروری سوال پیدا کر دیتا ہے۔ آخر تنقید کے بنیادی اصولوں کی اس قدر اہمیت کیوں ہے؟ اردو کے بعض نقادوں نے اس قسم کے سوالوں سے جی چرانے کی کوشش کی ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ان کے خیال میں تنقید کا سب سے بڑا مقصد کسی فنی تخلیق کی ترجمانی کرنا، اسے خود سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا ہے۔ پڑھنے والوں کو اس کے مزاج اور محاسن سے روشناس کرانا ہے اور بس۔ تاکہ وہ خود اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکیں۔ یہ سب کچھ کہہ کر دراصل تنقید کے بنیادی مسائل سے کترانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بہت صاف سی بات ہے کہ محاسن کی جانچ پڑتال تو ہم اسی وقت کر سکتے ہیں۔ جب ہمارے پاس پہلے سے کچھ پیمانے موجود ہوں۔ چنانچہ تنقید نگار محض اپنی پسند یا ناپسند ظاہر کر دینے پر اکتفا نہیں کر سکتا۔ اسے اس بات کا بھی شعور ہونا چاہیے کہ آخر جنھیں ہم محاسن کہتے ہیں۔ وہ محاسن کیوں ہیں۔ اس طرح نقائص کے بارہ میں بھی اس کا ذہن واضح ہونا چاہیے، گویا تنقید کرتے وقت اسے اپنے کاموں کا شعوری طور پر جائزہ لینا ہوگا، جس نے یہ محاسن یا نقائص ماخوذ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں نقاد کو کچھ لکھنے سے پہلے اپنے ذہن میں واضح کر لینا ہوگا۔ کہ ادب کیا ہے؟ اس کی ماہیت اور اس کا مقصد کیا ہے — اس کے لئے اسے ادب اور زندگی — متحرک اور بدلتی ہوئی زندگی — کے باہمی ربط کو بھی سمجھنا پڑے گا۔ اور بالآخر وہ زندگی کے مسائل سے دو چار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جواب تک ہمیشہ طبقات کی کشمکش سے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

ہمارے یہاں ادب اور زندگی کو دو الگ اور غیر متعلق خانوں میں تقسیم کرنے کی اکثر کوشش کی گئی ہے۔ آج بھی یہ خیال زندگی سے بھاگنے اور منہ موڑنے والے طبقہ کی طرف سے نئی اور پر فریب اصطلاحوں میں چھپا کر پیش ہوتا رہتا ہے۔ اس خیال کے مطابق زندگی انسان کے واقعی اور خارجی واقعات سے عبارت ہوتی ہے جن کا ادب پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ خیال محض غلط فہمی پر مبنی ہے اور ہمارے باشعور نقادوں نے کبھی بھی اس سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ ادب کی تمام قدریں (خواہ وہ کسی نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہوں) ادب و زندگی کے باہمی تعلق کے بارہ میں مختلف رجحانات کی ترجمان ہوتی ہیں، جو لوگ تنقید کے بنیادی اصولوں یا ادب کی بنیادی قدروں سے گریز کرتے ہیں یا ان اصولوں اور قدروں کو مجرد اور مطلق تصورات سے اخذ کرتے ہیں۔ وہ دراصل زندگی کے بنیادی مسائل سے دامن بچانا چاہتے ہیں۔ انھیں شاید اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ ادب کی نشو و نما زندگی کی زرخیز اور جاندار مٹی سے ہوتی ہے، ادبی قدروں اور تنقیدی اصولوں کا ماخذ بھی زندگی کے علاوہ کچھ نہیں کیونکہ اگر ایک طرف، ادب اپنے موضوع کے لئے زندگی سے خام مواد حاصل کرتا ہے تو دوسری طرف تنقید بھی اپنے اصولوں کے یقین میں زندگی کے خارجی حالات کا سہارا لئے بغیر نہیں رہ سکتی جو نقاد ادب زندگی کے باہمی تعلق پر گہری نظر ڈالنے سے قاصر ہیں وہ بالعموم مجرد اور مطلق تصورات میں پھنس کر موضوع پر ناقدانہ نظر نہیں ڈال پاتے اور لامحالہ ان کی نظر صرف اس کی د   ے پر پڑتی ہے۔ وہ الفاظ کی نشست، بندش کی چستی، اور ترکیب کی درستی کو حاصل فن سمجھنے لگتے ہیں انھیں ادبی حسن، زبان و بیان، ہی نظر آنے لگتا ہے۔ اور اس طرح وہ ادب کے ظاہری پیکر پر ادبی حقیقت کا گمان کرنے لگتے ہیں۔ یہ لوگ، دراصل نقاد نہیں صرف میکانکی ہوتے ہیں۔ جو اپنے خود ساختہ کل پرزوں کی درولبست کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہیں۔ وہ مشین کی افادیت، اس سے پیدا ہونے والے سماجی

روابط سے نابلد ہوتے ہیں۔ ان کا مطمحِ نظر مشین کے پرزوں تک محدود رہتا ہے، بلکہ اسی میں گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ بحیثیت میکانک کے وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ مشین کے پرزے اپنی اپنی جگہ ٹھیک کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ اس مشین سے جو چیز تیار ہوتی ہے اس کا زندگی میں کیا مصرف ہے؟ — آیا وہ چیز سماج کے لئے باعثِ برکت ہے یا موجبِ لعنت، — اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ گویا میکانکی نقاد کی حیثیت سے وہ صرف یہ دیکھتے ہیں۔ کہ جن جذبات و خیالات کو پیش کیا گیا ہے وہ سب کے سب زبان و بیان کے شکنجہ میں اس طرح آگئے ہیں یا نہیں کہ ان کی نمود بجائے خود حسین معلوم ہونے لگے، اس نقطۂ نظر کے مطابق نقاد "نکلتے" ہوئے گلاب کی خوشبو اور شگفتگی سے لطف اندوز ہونے کی بجائے کاغذی پھولوں کی ظاہری نمائش سے دل بہلانے لگتا ہے، تنقید کے اس نظریہ میں کوئی ظاہری یا منطقی قباحت نہیں۔ ایک نقاد خالص یا مجرد نقاد کی حیثیت سے خالص جمالیاتی یا خالص فنی نقطۂ نظر کا حامل ہو سکتا ہے، لیکن ایسا نقاد خلّاق یا ناقد نہیں صرف میکانک ہوتا ہے، جو نہ تو زندہ اور جاندار ادب کی تخلیق میں کوئی مدد دیتا ہے اور نہ نبضِ کائنات کو محسوس کر سکتا ہے۔ عملی دنیا میں ادیب یا نقاد خالص یا مجرد نہیں بلکہ انسان کی حیثیت سے سب سے پہلے سماج — اور وہ بھی طبقاتی سماج — کا ایک فرد ہوتا ہے۔ وہ ایک فرد پہلے ہوتا ہے اور ادیب یا نقاد بعد میں۔

اردو کے نباض و میکانک کی تفریق کو پوری طرح سمجھنے اور ان کے بنیادی اصولوں کا طبقاتی تجزیہ کرنے سے پہلے ہمیں اردو ادب و تنقید کی ارتقائی رفتار کا طبقاتی روشنی میں جائزہ لینا ہوگا۔ کیونکہ ادب و تنقید کی ارتقا ہمیشہ ادیب یا نقاد کے "فرد" سے وابستہ رہی ہے، جو اب تک ہمیشہ مخصوص طبقاتی سماج کا مخلوق رہا ہے۔

تہذیب کے ابتدائی دور کو چھوڑ کر جس میں سماج، ذرائعِ پیداوار کے ان گھڑ ہونے کی وجہ سے غیر طبقاتی تھا، ہر دور میں انسانی سماج اپنے مخصوص ذرائعِ پیداوار کی بنا پر مختلف طبقوں میں منقسم رہا ہے، اور ایک نہ ایک طبقہ نے ذرائعِ پیداوار کو ترقی دے کر اور ان سے پیدا ہونے والے سماجی روابط کو ترقی یافتہ شکل میں از سرِ نو تشکیل دے کر انسانی جد و جہد کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے، اور یہی طبقہ اپنے زمانہ کا ترقی پسند طبقہ رہا ہے، تہذیب اور معاشرت، ادب اور آرٹ نے اسی طبقہ کا سہارا لے کر ارتقائی منازل طے کئے ہیں۔ اردو ادب و تنقید نے بھی زندہ رہنے اور حیات آفریں قدروں سے فیضیاب ہونے کے لئے ہمیشہ ابھرتے اور آگے بڑھتے ہوئے طبقہ کا سہارا لیا ہے،

ابتدا سے لے کر ۱۸۵۷ء تک اردو ادب زوال آمادہ جاگیردار طبقہ کے بجھے ہوئے مزاج سے ہم آہنگ رہا۔ جاگیردار طبقہ کی پژمردگی یا عیش پرستی، دلدلی پستی یا ماورائی بلندی اردو شاعری میں بھی جھلک آئی، جس سے یا تو وہ مضمحل و بے جان رہی یا صرف عاشقانہ (انفرادی) اور صوفیانہ (فراری اور ماورائی) شاعری میں محدود ہو کر رہ گئی۔ زندگی کی بے لبی یا بے کیفی اور ہوس پرستی یا روح پرستی کی بنا پر ایک طرف ادب بے جان، محدود یا انفرادی رہا تو دوسری طرف تنقید میں بھی رسمی (استنادی) محدود یا داخلی انداز قائم رہا، اس طرح ادب، شاعری اور وہ بھی عشقیہ شاعری کے دائرہ سے باہر نہ نکل سکا۔ اور نہ شعر و ادب کے اصولوں اور تنقیدی سانچوں میں کوئی وسعت پیدا ہو سکی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد جاگیردار طبقہ کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ کاروباری یا بورژوا طبقہ نمودار ہونے لگا۔ غدر نے جاگیردار طبقہ کے اثر کو جو پہلے ہی سے مضمحل تھا، بالکل ہی زائل کر دیا۔ مغرب کے اثر سے سائنس کے دور کی ابتدا ہوئی۔ نئی نئی ایجادات نے یہاں کے ذرائعِ پیداوار میں بھی ایک بنیادی تبدیلی یا انقلاب پیدا کر دیا۔ یہی ہندوستان کا صنعتی انقلاب تھا۔ غدر محض انگریز تاجروں اور دیسی راجاؤں کی باہمی آویزش کا مظہر نہیں ہے۔ اس آویزش کے پیچھے دو تہذیبیں بلکہ دو نظام برسرِ پیکار تھے، — ایک طرف جاگیرداری نظام اور دوسری

طرف کاروباری یا صنعتی نظام۔ صنعتی نظام نے بالآخر فتح پائی اور اسی کے ساتھ ہندوستان میں ایک نیا ترقی پذیر طبقہ ابھرا جس نے سائنس کے دئے ہوئے ترقی یافتہ ذرائع پیداوار سے فائدہ اٹھا کر زندگی کو آگے بڑھانے میں مدد دی، اور نئی تہذیب یا نئے نظام سے اپنی زندگی کا نیا خاکہ لیا سرسید کی اصلاحی تحریک اسی طبقہ کی نمائندہ تھی، یہ تحریک اپنے دور کے ترقی پسند طبقہ کی نمائندہ تھی، اور اسی لئے اس دور کی رہنمائی بھی کر رہی تھی اس تحریک کے زیر اثر زندگی اور اسی کے ساتھ ادب کے نئے اصول مرتب کئے گئے، نئے تقاضوں نے بے کیفی و بے لبی اور ہوس پرستی و روح پرستی کی جگہ زندگی کی تڑپ اور جدوجہد کا ولولہ پیدا کیا۔ ادب کو اپنے ماحول کی مخصوص واقعیت سے ہم آہنگ کرنے اور اس میں ترقی پذیر طبقہ کی علمی اور سماجی زندگی کی تڑپ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اردو ادب نے پہلی بار انفرادی، اور فراری یعنی درباری اور خانقاہی زندگی کے تنگ دائرے سے نکل کر علمی اور سماجی زندگی کی کھلی فضا میں سانس لی۔ ادب کے علمی اور افادی پہلو پر بھی زور دیا گیا۔ ادب کا یہی سماجی، علمی اور افادی رجحان ہے جو حالی کی تنقید میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ سرسید کی تحریک نے جس کے ایک بڑے علم بردار حالی بھی تھے، تاریخی تقاضوں کی پشت پناہی میں ادب کے ایک نئے اور حیات انگیز دور کا آغاز کیا جو اپنے ماحول اور اپنے زمانہ کے ابھرتے ہوئے طبقہ کا مقتضی تھا۔ ادب انفرادی اور داخلی زندگی کے خول سے نکل کر علمی زندگی سے ہم آغوش ہوا تو تنقید کی بنیاد بھی ذاتی پسند کی بجائے نئے ادب اور نئی زندگی کے باہمی ربط سے پیدا ہونے والے خارجی (OBJECTIVE) اصولوں پر رکھی گئی۔ حالی جو نئے ادب کے سب سے بڑے نقاد تھے، ادیب اور سماج کے نامیاتی ربط سے واقف تھے، اس لحاظ سے وہ اردو ادب کے سب سے پہلے نقاد ہیں جنھوں نے ادبی قدروں کی بنیاد ادب و زندگی کے باہمی ربط میں تلاش کی۔

اگر غدر سے لے کر اب تک ادبی رفتار کا جائزہ لیا جائے تو ہم موجودہ انقلابی یا ترقی پسند تحریک اور حالی کے اصلاحی دور میں براہ راست ایک ارتقائی ربط محسوس کر سکتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے بھی اصلاحی تحریک کی طرح اپنے زمانہ کے ابھرتے ہوئے طبقہ کا سہارا لیا ہے اصلاحی تحریک اگر غدر کے بعد پیدا ہونے والے سماجی تقاضوں کو پورا کر رہی تھی تو موجودہ انقلابی تحریک کو بھی جنگ عظیم کے بعد پیدا ہونے والے حالات نے جنم دیا ہے۔

۱۸۵۷ء کی طرح ۱۹۱۴ء کو بھی اردو ادب کے دھارے کا رخ بدلنے میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ دنیا کی تاریخ میں پچھلی جنگ عظیم ایک ایسی حد فاصل ہے جس کے دونوں جانب دو مختلف رجحانات کی صاف اور واضح سرحدیں نظر آتی ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم ختم ہوتے ہی دنیا میں ایک زبردست تبدیلی کا احساس پیدا ہونے لگا۔ جس کو سرمایہ اور محنت کی طبقاتی کشمکش نے جنم دیا تھا۔ اسی زمانہ میں روس کا عظیم الشان انقلاب رونما ہوا جس نے ایک نئے نظام کی تشکیل کی اور پہلی بار طبقاتی نظام کو ختم کیا۔ یہ نظام اس عام انتشار اور بدحالی کا شعوری اور علمی نتیجہ تھا، جسے حاکم و محکوم کی باہمی کشمکش نے جنم دیا تھا، اس نظام نے انسان کو مشین اور مشین کے مالک کی غلامی سے آزاد کیا جس کا اثر قدرتی طور پر ہندوستان جیسے غلام اور بدحال ملک پر بھی پڑا کیونکہ یہاں بھی عالم گیر معاشی بدحالی کا براہ راست اثر پڑ رہا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے باشعور ادیب و دانش ور روس کے اس نئے نظام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اس لئے کہ انقلاب روس جاگیر و سرمایہ سے پیدا ہونے والی الجھنوں اور لعنتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی پہلی باشعور اور کامیاب کوشش کی تھی، اس طرح انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام اسی عالم گیر انتشار اور بے چینی کے خلاف ایک شعوری ادبی کاوش ہے جس سے گلو خلاصی حاصل کرنے میں روس کو اپنے مقامی حالات کی بنا پر سب سے پہلے کامیابی ہوئی، یہ خیال محض غلط فہمی پر مبنی ہے کہ ترقی پسند تحریک باہر سے لا کر یہاں مسلط کی گئی ہے اس غلط فہمی کی غالباً وجہ یہ ہے کہ پچھلی جنگ عظیم نے جن بنیادی مسائل کو تہہ سے ابھار کر سطح پر نمایاں کر دیا تھا۔ ان کو حل کرنے کے لئے ہر ملک کے باشعور ادیب اور دانشور جس طرح سوچ رہے تھے، اس میں ایک بنیادی اشتراک تھا۔ وہ اصلاح سے نا امید تھے، اور بنیادی تبدیلی کا مطالبہ کر رہے تھے۔

غرض اردو ادب کی اصلاحی تحریک ہو یا انقلابی تحریک دونوں نے اپنے عہد میں زندگی، آگے بڑھتی ہوئی زندگی کی ترجمانی کی دونوں نے ابھرتے اور آگے بڑھتے ہوئے طبقہ کا سہارا لیا اور اسی لئے دونوں نے ادب اور تنقید کو تازگی اور زندگی بخشی۔ ان دونوں زندہ تحریکوں کے متوازی ان کا ردِ عمل بھی ہوتا رہا جس سے زوال آمادہ اور ہزیمت خوردہ طبقہ کی رجعت کا اظہار ہوتا ہے اس ردِ عمل کی ترجمانی حالی کے دور میں ان کے اپنے ہمعصروں (اودھ پنچ اسکول) اور بعد میں آنے والوں نے کی جنھوں نے ادب کی جمالیاتی قدروں کو بدلتی ہوئی زندگی سے اخذ کرنے کی بجائے فرسودہ روایات یا مجرد تصورات سے اخذ کیا۔ ترقی پسند تحریک کے زمانہ میں اس کا اظہار فنی نقادوں کی تحریروں میں ہوا ہے اور اب بھی ہوتا ہے جو فن کو مقدس کہہ کر زندگی سے بلند و برتر رکھنا چاہتے ہیں اس عمل و ردِ عمل کو ہم سہولت کے لئے "فن برائے حیات" اور "فن برائے فن" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ ایک کا نمائندہ نباض ہوتا ہے اور دوسرے کا میکانک۔ ان دونوں رجحانات کا تجزیہ کرنے اور ان کی طبقاتی اساس دریافت کرنے میں ذرا تفصیلی بحث کرنی ہوگی۔

"فن برائے فن" کا جو مفہوم ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ ادب ایک مقدس فن ہے جس کو زندگی سے کوئی علاقہ نہیں یہ مفہوم غلط ہے یا صحیح اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ہم جب ادب کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس کی جڑیں زندگی، طبقاتی زندگی میں پھیلی ہوئی ملتی ہیں۔ فن کار جس وقت تخلیق کرتا ہے۔ نظم یا افسانہ لکھتا ہے اس وقت ممکن ہے اسے یہی گمان ہوتا ہو کہ تخلیق کا مقصد فن برائے فن کے علاوہ کچھ نہیں۔ لیکن فنکار سب سے پہلے سماج کا ایک فرد ہوتا ہے، اس لئے ادب کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر خواہ کچھ ہو۔ اس کی گذشتہ زندگی اس کی طبقاتی تعلیم، اس کے تعصبات و تجربات اس کی تخلیق میں جھلکے بغیر نہیں رہ سکتے، دراصل ہمارا حافظہ ہی ہر طرح کے فن کو جنم دیتا ہے اور حافظہ کی پرورش غیر مادی مطلق اور مجرد تصورات پر نہیں، بلکہ ہمارے تجربات، تعلیم اور مخصوص سماجی ماحول (جس میں طبقاتی امتیازات ہیں) کی مخصوص واقعیت پر ہوتی ہے۔ شاعر کے تجربات بدلتے ہیں تو اس کا اثر اس کے خیالات و تاثرات پر بھی پڑتا ہے اور اس طرح شاعر کے خارجی تجربات بالواسطہ اس کی تخلیق پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میرؔ و غالبؔ اپنے زمانہ کی مخصوص زندگی اور مخصوص طبقہ کی پیداوار تھے۔ لیکن آج مزدوروں میں کام کرنے والے شاعر کے اندر میرؔ و غالبؔ دوبارہ جنم نہیں لے سکتے اسی طرح خود اس زمانہ میں جگرؔ اور ساحرؔ دو مخصوص طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ساحرؔ کا تاج محل سے متعلق یہ شعر :-

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

حشر تک جگرؔ یا کسی ایسے شاعر کے قلم سے نہیں نکل سکتا جو ذہنی طور پر محنت کش طبقہ کے ساتھ وابستہ نہیں، اسی لئے "فن برائے فن" کے اس مفہوم کو کوئی بھی از خود قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ : "ادب کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں" —— لیکن جن لوگوں پر یہ لیبل چپاں کیا جاتا ہے ان کے تنقیدی اور ادبی مفروضات کا تجزیہ ہمیں منطقی طور پر اسی نتیجہ پر پہونچاتا ہے کہ غیر شعوری طور پر وہ "فن برائے فن" کے قائل ہیں۔ خواہ اس مفہوم سے دامن بچانے کے لئے کتنی ہی دلیلیں اور تاویلیں ان کی طرف سے کیوں نہ پیش کی جائیں، "فن برائے فن" کا نظریہ جن لوگوں سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل وہ لوگ ہیں جو ادب کی جمالیاتی اور فنی قدروں کو زندگی سے الگ کر کے دیکھتے ہیں اور انھیں کو معیارِ تنقید سمجھتے ہیں۔ اسے سمجھنے کے لئے ان کے تنقیدی اور ادبی مفروضات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔

اردو میں خالص جمالیاتی تنقید کا رجحان، حالیؔ کے جونیر معاصر مہدی الافادی سے شروع ہوتا ہے، وہ ادب کو سب سے پہلے حسن پرستی کا ایک وسیلہ سمجھتے ہیں۔ مہدی کا خیال ہے کہ حسن پرستی کے لئے کسی خارجی جواز کی ضرورت نہیں۔ اس لئے ادب کا مقصد سوائے حسن و تخلیقِ حسن کے اور کچھ نہیں۔ اور نہ صناعی کے علاوہ ادب کا کوئی معیار ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہدی اپنی تنقید و تحریر میں صناعی اور حسن اسلوب

کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔

مہدی ادب کو صرف اس معیار پر جانچنے کے قائل ہیں کہ کہاں تک وہ ان کے ذوقِ حسن کی تسکین کرتا ہے اس ذوقِ حسن کی بنیاد ان کے یہاں ذاتی وجدان پر ہے، جو ایک داخلی صلاحیت ہے اور جس کا اجتماعی اور خارجی ماحول سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی تنقید میں داخلیت کو زیادہ دخل ہوتا ہے، بلکہ ان کی بنیاد ہی داخلیت کو زیادہ دخل ہوتا ہے بلکہ ان کی بنیاد ہی داخلیت پر ہوتی ہے،

سجاد انصاری بھی تنقیدی مسلک میں مہدی کے پیرو ہیں، ان کا خیال ہے کہ "شاعری پر تنقید کرنے کے لئے ذوقِ صحیح کی ضرورت ہے اور تنقید نگار کی آخری دلیل مذاقِ لطیف" ــــ گویا تنقید کی بنیاد "خارجی اعتبارات" یا منطقی استدلال" پر قائم کرنا ان کے نزدیک "شعرا مرا بمدرسہ کہ برد" کے مصداق ہے، اسی لئے خالص جمالیاتی تنقید کا آخری حربہ سوائے وجدان کے اور کچھ نہیں ہو سکتا، کیونکہ وجدان ہی ایک ایسا حصار ہے جس میں بدلتی ہوئی دنیا سے بھاگ کر پناہ لی جا سکتی ہے!

سوال یہ ہے کہ وجدان ہے کیا؟ جمالیاتی نقادوں کے خیال کے مطابق وجدان یا جمالیاتی حسن ایک ابدی صلاحیت ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ زندگی کے بدلنے سے اخلاقیات کے نظریئے بدل سکتے ہیں۔ علم میں تغیر و اضافہ ہو سکتا ہے، لیکن حسن کا تصور مطلق ہے اور اسی کے ساتھ احساسِ حسن یا وجدان بھی اٹل ہے جس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا، ادب کی بنیاد ایسی بنیاد جو مستقل اور ابدی ہو، بدلتی ہوئی زندگی کے اضافی معیار پر نہیں رکھی جا سکتی، اس لئے ادب کی ابدی قدر حسنِ مطلق ہے اور اس کا معیار وجدان۔ لیکن ان نقادوں سے جائز طور پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا حسن کا تصور ہر شخص، ہر طبقہ اور ہر زمانے کے لئے یکساں ہوتا ہے، جواب تو یہی ملے گا، کہ ہاں! جو چیز کسی ایک فرد یا کسی ایک ماحول کے لئے حسین ہے وہ ہی دوسرے فرد اور دوسرے ماحول کے لئے بھی حسین ہوگی، لیکن تاریخ کا مطالعہ اس خیال کی تردید کرتا ہے، کیا بارہویں صدی کے انسان اپنے تجربوں اور نظریوں کی رو سے ویسے ہی تھے، جیسا کہ اس بیسویں صدی کے انسان ہوتے ہیں۔ کیا ان کے سامنے بھی زندگی اور اسی کے ساتھ حسن کی وہی قدریں تھیں جو ہمارے سامنے ہیں؟۔ غدر سے پہلے بادشاہوں اور نوابوں کا دربار جما ہوا تھا، غدر کے بعد صنعتی اور کاروباری لوگوں نے اپنا سکّہ چلایا۔ بیسویں صدی میں سرمایہ داروں، ساہوکاروں اور ان سے مقابلہ کرنے والے مزدوروں کی کشمکش زندگی پر چھا گئی، کیا ان مختلف طبقوں کی پسند و ناپسندیدگی، خیالات و رجحانات۔ غرض ان کی زندگی کے پورے PERSPECTIVE میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے؟

غدر سے پہلے کے صوفی اور غزل گو شعرا اپنے احساسات و جذبات، خیالات و رجحانات میں غدر کے بعد کے اصلاحی اور قومی ادیبوں سے بالکل مختلف تھے، اسی طرح موخر الذکر دور کے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور ۳۵ء کے بعد کے انقلابی ادیبوں، شاعروں، فسانہ نویسوں اور مفکروں میں ایک بنیادی فرق پایا جاتا ہے، یہ بنیادی فرق ادیبوں اور فن کاروں کا ذاتی معاملہ نہیں ہے اس کے پیچھے مخصوص طبقاتی رجحانات کارفرما ہیں جو بدلتے ہوئے زمانہ کے سماجی حالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس طرح ادبی حسن کا تصور کوئی ابدی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ حسن کا تعلق بھی اپنے ماحول سے ہوتا ہے، اس لئے حسن یا احساسِ حسن کو زندگی سے علٰحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

موجودہ دور کے جو نقاد فنی نقطۂ نظر سے فنونِ لطیفہ کو "قائم بالذات" اور "مقصود بالذات" سمجھتے ہیں، ان میں جعفر علی خاں اثر اور کلیم الدین احمد کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے معیارِ تنقید اور طرزِ تنقید میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن جہاں تک ادب کے مقصد کا تعلق ہے دونوں کے خیالات بڑی حد تک مشترک ہیں جعفر علی خاں کا خیال ہے کہ "ادب کا مقصد نشاطِ دل و دماغ کے سوا کچھ نہیں اس لئے موضوع کچھ بھی طرزِ ادا میں فن کارانہ بانکپن کا قائم رہنا ضروری ہے"، آگے چل کر لکھتے ہیں، "ادب کا مقصود بالذات دماغی یا روحانی مسرت یا تسکین مہیا کرنے کے سوا کچھ نہیں اور ادب برائے زندگی جو اس مقصد سے ہٹ کر شاعری کو اس کی بلندیوں اور لطافتوں سے محروم کر کے

کثافت وگندگی میں آلودہ کرنا چاہتی ہے تو حیات کی تفسیر ہے نہ ترجمانی" ـــــ گویا ادب کو زندگی کی مکروہات سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن یہ محض ایک خوش آئند فریب ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ ادب کا "دامن تقدس" "زندگی کی آلائشوں" اور طبقاتی "مکروہات" سے "داغدار" نہ ہو، ادب زندگی (بصورت موجودہ طبقاتی رجحانات) کا آئینہ دار ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح حکومت باوجود اپنی غیرجانبداری اور انصاف پسندی کے اور باوصف اپنے تقدس کے طبقاتی مفاد اور زندگی کی مکروہات سے آلودہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

کلیم الدین احمد بھی ایک طرح سے جعفر علی خاں کے ہم خیال ہیں، ان کا دعوٰی ہے "شاعری ان بنیادی چیزوں سے وابستہ ہے جو کبھی نہیں بدلتیں۔ اس لئے جہاں شاعری پائیدار ہے وہاں اخلاق (اور اسی کے افادہ بھی) ناپائدار اور تغیر پذیر ہے۔ پھر دونوں میں تعلق ممکن نہیں" سوال یہ ہے کہ وہ بنیادی اور ابدی چیزیں کیا ہیں جن سے شاعری وابستہ ہے؟۔ انصاف؟ توازن؟ صلح و آشتی؟ ـــــ لیکن یہ تو مجرد تصورات ہیں جو مخصوص سماج اور مخصوص طبقوں کی زندگی سے ماورا ریاضی کے بے جان فارمولوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، زندگی طبقاتی زندگی سے الگ ان کی حیثیت بے جان بلکہ بے معنی الفاظ سے زیادہ نہیں ـــ پھر؟ عام انسانی جذبات، لیکن انھیں بھی عام طبقاتی زندگی سے الگ کر کے کیسے دیکھا جا سکتا ہے۔ کلیم الدین احمد شاید کہیں کہ چونکہ حیاتیاتی (　　　　　　) تجربات مثلاً محبت و نفرت، خوف و غصہ، کمتری و برتری، خود پرستی و خود نمائی، آفاقی و ابدی محرکات ہیں، اس لئے طبقاتی زندگی یا زندگی کی بدلتی ہوئی واقعیت سے بلند و ماورا ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو شکلیں یہ محرکات اختیار کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر جو عناصر ان محرکات کو حرکت میں لاتے ہیں وہ زندگی کے مخصوص طبقاتی کلچر کے نہ صرف پابند ہوتے ہیں بلکہ اسی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس لئے کلیم الدین کا یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ جاندار آرٹ انتہائی کوشش کے باوجود بھی خالص یا مجرد (ABSTRACT) جذبات کا عکاس نہیں ہو سکتا، (خالص یا مجرد جذبات سے میری مراد ان جذبات سے ہے جنھیں زندگی (طبقاتی زندگی) سے الگ فرض کر لیا گیا ہو) جس ادب میں اس کی کوشش کی جائے گی وہ اپنی اثر انگیزی کھو دے گا، اور خود بھی اپنے موضوع کی طرح مجرد، بے کیف اور بے جان ہو کر رہ جائے گا۔ بہترین ادب وہ ہے جو مخصوص جذبات کو اپنے زمانہ کی مخصوص واقعیت کے سانچے . . . میں اس کامیابی کے ساتھ پیش کر سکے کہ دوسرے لوگ بھی جو اسی قسم کے تجربات سے گذر چکے ہیں۔ فوراً اس میں اپنی زندگی کی جھلک دیکھ لیں۔ مختصر یہ کہ کوئی احساس یا جذبہ اپنے مخصوص خارجی واقعہ سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا اور خارجی واقعہ کا براہ راست تعلق طبقاتی سماج سے ہوتا ہے۔

انہی غلط فہمیوں کے ماتحت جب جمالیاتی یا فنی نقاد کسی نظم یا افسانہ پر تنقید کرتے ہیں، تو اسے اہمیت نہیں دیتے کہ شاعر یا ادیب کے خیالات وجذبات کیا ہیں اور ان کا اس کے سماج یا ماحول میں کیا درجہ ہے۔ وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ شاعر یا ادیب نے ان جذبات وخیالات کو کس طرح پیش کیا ہے۔ اس طرح وہ ادب کی صناعی کو ہر دوسری چیز پر مقدم سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک ادب کا مقصد زندگی کی عکاسی کرنا اس کو سدھارنا اور سنوارنا نہیں بلکہ "ذوق حسن کو تسکین دینا" اور "ابدی محرکات کی عکاسی کرنا ہے" ـــــ گویا حسن یا ابدی محرکات کا زندگی سے اور ابھی کوئی وجود ہے اس رجحان کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ ادبا حسن کو زندگی سے الگ کر کے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کا نظریہ تجریدی ہوتا ہے۔ وہ انسانی فکر اور اس کے عمل کو علٰحدہ علٰحدہ دیکھتے ہیں۔ وہ تجرید کی مدد سے ادب کا جائزہ لیتے ہیں اور حسن کی ابدی قدروں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ابدی حسن ادب کے موضوع یعنی انسانی جذبات وخیالات میں تو مل نہیں سکتا کیونکہ جذبات وخیالات زندگی سے ملوث ہوتے ہیں جو تغیر پذیر ہے اور جس میں ان کے خیال کے مطابق کوئی ترتیب وتنظیم نہیں۔ اس لئے یہ حسن ادب کے موضوع میں تلاش کرنے کی بجائے وہ اسے ادب کے اسلوب سے اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ تنقید کرتے وقت وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ مخصوص خیالات وجذبات میں اندرونی تناسب (INTERNAL COHERENCE) ہے یا نہیں۔ وہ نظم یا افسانہ کے مواد یعنی جذبات وخیالات سے بحث نہیں کرتے۔ وہ تخلیق کو کسی خارجی

معیار پر پرکھنا ادبی تنقید کے دائرے سے باہر سمجھتے ہیں۔

یہ نظریہ بھی ہر نظریہ کی طرح مخصوص طبقاتی مفاد کا آئینہ دار ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ادبی حسن کا دار و مدار ایسی ابدی اور آفاقی قدروں پر ہے جو بدلتی ہوئی زندگی اور طبقاتی کشمکش سے بلند ہیں۔ بظاہر معلوم ہوگا کہ اس نقطۂ نظر کو اپنے زمانہ کی سماجی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہے اس لئے کہ یہ نقطۂ نظر بذات خود زندگی سے گریزاں ہے۔ لیکن اگر ہم اس کو سماجی سٹنگ میں رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس کو بھی ایک مخصوص طبقہ کے مخصوص حالات نے جنم دیا ہے۔ اس نظریہ کے ماننے والے یہ نہیں دیکھتے کہ ادب اور زندگی میں کیا ربط ہے اور اس رابطہ سے تنقید کے کن اصولوں کو اخذ کیا جا سکتا ہے انھیں تو ایک طرح کا اعتقاد ہو گیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ادب اور زندگی میں کوئی رابطہ نہ ہونا چاہیئے۔ یہ ان کا فریب آرزو (WISHFUL THINKING) ہے جو ان کے طبقہ کی مخصوص زندگی اور رجحانات کی غمازی کرتا ہے، وہ حقائق ( ) سے نہیں اپنے طبقہ کی مخصوص قدروں سے بحث کرتے ہیں جو آگے بڑھتی ہوئی زندگی کا سامنا کرتے ہوئے جھجکتی ہیں۔ وہ بدلتی ہوئی زندگی سے نہیں بلکہ مجرد تصورات سے تقویت حاصل کرنا چاہتے ہیں کیونکہ بدلتی ہوئی زندگی ان کے انحطاط پذیر طبقہ اور اس کے متوازی نظام کے لئے خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ وہ زندگی کا مقابلہ کرتے ہوئے ڈرتے ہیں اور اس سے ذہنی طور پر چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اپنے خود ساختہ تصورات میں پناہ تلاش کرتے ہیں —— جمالیاتی یا فنی نقاد اپنے طبقہ کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے اصولوں کو بدلتی ہوئی زندگی سے اخذ کرنے کی بجائے اٹل، ہمہ گیر اور ابدی، تصورات سے اخذ کرتے ہیں۔ جو بیک وقت مجرد اور مردہ بھی ہوتے ہیں

ہمارے ان نقادوں نے ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھنے کی بجائے اسے ابدی حسن کا مظہر سمجھا، اس طرح، ابدی حسن اور ابدی قدروں کے مجرد، اور ادبی محرکات کے بے جان تصور سے ادب میں انفرادی اور تنقید میں تجریدی میلانات نفوذ کر گئے جنھوں نے سماجی زندگی کو بہت کم اہمیت دی۔ اس قسم کے نقاد زندگی کے نئے حالات سے بھاگ کر اپنی نجی اور تجریدی دنیا میں محصور ہو گئے اور اب بھی محصور ہیں۔ یہ ایک طرح کی ادبی رہبانیت ہے جس کے طلسم کو توڑنے کے لئے ترقی پسند نقادوں نے حالی کے صحیح جانشیں اور نئے ترقی پذیر طبقہ کے ترجمان کی حیثیت سے فن برائے حیات کے نظریہ پر زور دیا اور تنقید کی بنیاد ادب اور زندگی کے باہمی ربط سے پیدا ہونے والے خارجی اصولوں پر رکھی۔

ترقی پسند تنقید کی بنیاد مارکسی فلسفہ پر ہے۔ مارکسی فلسفہ دراصل کوئی نظام فلسفہ ( ) نہیں جو علمی اور مجرد تصورات پر مبنی ہو۔ یہ تو مادی دنیا، اس میں رہنے والے انسانوں اور ان کے بنائے ہوئے سماج کے تغیرات کو سمجھنے کا ایک اٹل توضیحی اور سائنٹفک طریقہ ہے جو خود بھی مادی تجربات سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ نہ صرف مادی، معاشی، تہذیبی بلکہ سماج کے دوسرے پہلوؤں مثلاً ادب و آرٹ کے مسائل کے سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ چونکہ ترقی پسند تنقید کی بنیاد مارکسی فلسفہ پر ہے اس لئے ادب سے متعلق اس کے چند بنیادی اصولوں کا جنھیں اردو میں اکثر و بیشتر پیش کیا جا چکا ہے اعادہ کرنا بے جا نہ ہوگا۔

مارکسی نقطۂ نظر سے مادی دنیا انسانی فکر سے پہلے موجود تھی اور انسانی فکر اسی مادی دنیا کی حرکت سے پیدا ہوئی۔ انسانی سماج کی بنیاد اسی مادی دنیا پر ہے، ادب سماج کا ایک مظہر ہے اس لئے ادب بھی بالآخر مادی دنیا کی ایک پیداوار ہے۔

مارکسیت کے نزدیک مادہ غیر متحرک اور ٹھس نہیں بلکہ متحرک اور مائل بہ ارتقا ہے اس لئے بدلتے ہوئے سماج کے ساتھ سماجی اور ادبی قدروں کا تغیر پذیر ہونا بھی ناگزیر ہے۔

ادب انسانی خیالات و جذبات کے اظہار کا نام ہے جو خلا میں نہیں مخصوص ماحول میں پرورش پاتے ہیں۔ مارکسی نقطۂ نظر سے عمل یعنی مادی اور سماجی حرکت کو خیال یا نظریہ پر فوقیت ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے خیالات و جذبات بھی زندگی کو بدلتے اور سنوارتے ہیں۔ لیکن یہ خود ان عناصر کی پیداوار ہوتے ہیں۔ جن کو زمانہ یا ماحول کہتے ہیں۔ اسی لئے مادہ یا وجود کو انسانی افکار یا اقدار پر مقدم مانا جاتا ہے۔ علم یا فکر کو عمل کا تابع مان کر دونوں

کی یکجہتی پر زور دیا جاتا ہے۔

مارکسی نقاد عمل ردعمل سے بڑھتی پھیلی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ادیب نے کہاں تک زندگی کی جدوجہد میں شریک ہوکر یا اس سے ہم ساز ہوکر اس کی تڑپ کو محسوس کیا ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے ادب میں نہ تو اثر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ توانائی۔

چونکہ زندگی بدلتی رہتی ہے او اسی کے ساتھ ادب بھی اس لئے مارکسی نقاد زندگی کی اس متحرک قوت کو مانتا ہے۔ جس کو تاریخ کہتے ہیں تاریخ۔ ایک ایسی جدلیاتی قوت ہے جو پرانی اور فرسودہ وضع کی تردید اس لئے کرتی ہے تاکہ نئی وضع پیدا کرے جو پرانی وضع سے بہتر ہو۔ اسی لئے تو مارکسی نقاد ادب کا مطالعہ تاریخ کی روشنی میں کرتا ہے اور مارکسی ادیب ادب کی تخلیق تاریخی تقاضوں کے پس منظر میں۔

ادب اور زندگی میں نامیاتی ربط ہونے کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ دونوں میں یک وقت دیک رفتار تبدیلی واقع ہو۔ کبھی کبھی تو ادب اور آرٹ اپنی تیز رفتاری میں خواب کی طرح زندگی کو ناگھ کر اس سے آگے نکل جاتا ہے۔ اس میں ہماری آرزوئیں اور خواہشیں بے ساختہ پھوٹ نکلتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر ادب اپنی رفتار میں خارجی یا سماجی زندگی سے بچھڑ جاتا ہے۔ ہمارے جذبات خیالات سے زیادہ پختہ اور راسخ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں تبدیلی کی رفتار نسبتاً سست ہوتی ہے۔ اکثر سائنس داں انہی معتقدات کا شکار رہتے ہیں۔ جنھیں عرصہ ہوا سائنس باطل کر چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادی انکشاف یا خارجی تبدیلی کا شعور پہلے اور اثر بعد میں ہوتا ہے۔ اس طرح ہمارے جذبہ اور خیال میں ہماری نفسیاتی اور خارجی دیا عملی، زندگی میں ایک طرح کا تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ بالغ نظر اور باشعور نقاد یا ادیب پر خارجی تبدیلی کا اثر نسبتاً پہلے ہوتا ہے اور وہ بآسانی اس تضاد کو حل کر کے اپنی عملی اور نفسیاتی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے۔ اس کا ذہن زیادہ بیدار بھی ہوتا ہے اور زیادہ حساس بھی، وہ اپنے احساس و شعور کو سماج سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ وہ ایک بے جان مشین کی طرح سماج کے فوٹو کھینچنے پر اکتفا نہیں کرتا ہے۔ وہ حقیقت کو صرف اس شکل میں نہیں دیکھتا کہ دنیا کیسی ہے، بلکہ یہ بھی معلوم کرتا ہے کہ دنیا جیسی کچھ ہے اس کی بنیاد پر اسے کیسا ہونا چاہئے۔ اس طرح اس کے نزدیک واقعیت کا جامد نہیں متحرک تصور ہوتا ہے جو اسے حقیقت کا تخلیقی عکس (CREATIVE REFLECTION) پیش کرنے پر مجبور کرتا ہے —— تخلیقی عکس جس میں حال کی واقعیت اپنے بطن سے مستقبل کی تخلیق کرتی ہے۔

اس نقطۂ نظر کو ذہن میں رکھ کر موجودہ ترقی پسندی کو سمجھنا ہے۔ موجودہ ادب میں زندگی سے گریز بھی ملتا ہے، زندگی سے کشمکش بھی، رومانی زندگی بھی ملتی ہے اور طوفانی زندگی بھی، یہ تمام رجحانات زندگی کے کسی نہ کسی رخ کو ظاہر کرتے ہیں اور اس اعتبار سے زندگی کے عکاس ہیں لیکن یہ تمام رجحانات ترقی پذیر نہیں کہے جا سکتے۔ واقعیت کے متحرک تصور کی روشنی میں ترقی پذیر رجحانات صرف وہی ہیں جو آگے بڑھتی ہوئی زندگی اور مستقبل کی تخلیق کرنے والے طبقہ کو سہارا دے سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ آج کے رومانی ادب اور اس کے یاس انگیز لہجہ میں بھی ہماری زندگی کے ایک مخصوص گوشے یا ایک محدود طبقے کی زندگی جھلکنے لگے، لیکن وہ اس زمانہ کے بنیادی تقاضوں یعنی اجتماعی، عملی زندگی اور آگے بڑھتے ہوئے طبقہ کا عکس ربڑی مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ اس لئے ایسا ادب اور ایسی تنقید اس دور کی محض جزوی اور محدود زندگی یا خارجی واقعیت کی سطحی ترجمانی نہ کی گئی ہو بلکہ واقعات وحالات کے پس پشت جو قوتیں کام کر رہی ہیں ان کو سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہو، وہی۔ ترقی پسند ہے۔

اس سے قطع نظر کہ ادب کا منصب مستقبل کے غیر طبقاتی، سماج میں کیا ہوگا۔ ہمیں موجودہ دور کی بنیادی قوتوں کا ترقی پسندی کے اس نقطۂ نظر سے جائزہ لینا ہوگا۔ موجودہ دور میں طبقاتی کشمکش نے جو شدت اختیار کر لی ہے اس کے اثرات زندگی اور ادب دونوں میں نمایاں

ہیں۔ اس لئے اس کشمکش کو سمجھے اور اس میں حصہ لئے بغیر کوئی ادیب یا نقاد عظمت حاصل نہیں کر سکتا، ہر زمانہ کا شاعر اور نقاد اپنے زمانہ کی مہابھارت سے لیتا ہے۔ اس زمانہ کی مہابھارت وہ ہے جسے مزدور اور نچلے درمیانی طبقے کے محنت کش لوگ اس زمانہ کے بوسیدہ نظام کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ زندہ فنکار صرف زندہ طاقتوں ہی سے فیضان حاصل کر سکتا ہے۔ اس زمانہ کی زندہ طاقت محنت کش عوام ہیں جو زندگی کو نئے سرے سے ڈھالنے کے لئے عملی جدوجہد کر رہے ہیں۔ انقلاب کی تھرتھراتی ہوئی زندگی کو فنکار جس طرح عوامی جدوجہد میں شریک ہوکر یا اس سے وابستہ و ہم ساز ہوکر محسوس کر سکتا ہے۔ اس سے الگ رہ کر نہیں کر سکتا۔ فنکار انقلاب یعنی عملی جدوجہد کا یا تو ساتھ دیتا ہے یا اس سے بے تعلق رہتا ہے۔ اس کے مقاصد کے حصول میں مدد دیتا ہے یا اس کی جڑ کاٹتا ہے۔ اس کشمکش میں غیر جانب داری کا دعویٰ بے معنی ہے۔ جو ایسا کرتے یا کہتے ہیں وہ جدوجہد کا ساتھ نہیں دیتے بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح عملی زندگی کے نقطۂ نظر سے اس وقت ادیبوں اور نقادوں کو تین بڑے گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے (۱) وہ جو عوامی جدوجہد کے مخالفین ہیں (۲) وہ جو عوامی جدوجہد کے موافقین ہیں اور (۳) وہ جو عوامی جدوجہد میں مذبذین کا درجہ رکھتے ہیں —— پہلے گروہ کے لوگ زندہ ہونے کے باوجود مرچکے ہیں اور آخری گروہ کے فنکار وہ ہیں جو ادھ موئے ہیں۔ یعنی جن پر نزع کا عالم طاری ہے اور جو موت و زیست کے درمیان معلق رہ کر صرف انقلاب کا تماشہ دیکھنے کے قائل ہیں۔ یہی لوگ عوامی اور انقلابی شعرا کو انقلابی جماعت کا تابعدار مبلغ یا خدمت گذار کہہ کر اپنی حقارت کا اظہار کرتے ہیں اور خود اپنی خواہش پرستی کے تنگ دائرہ میں رہ کر بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اپنے ادبی اقتدار کا ادعا کرتے ہیں اور ترقی پسندی کی اصلاح کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں! ایسے فنکار اور نقاد زمین پر رہتے ہوئے بھی صرف ستاروں سے سرگوشیاں کرنا پسند کرتے ہیں، ادب و تنقید کو عملی یا عوامی زندگی سے بلند و برتر سمجھنا ایک ایسا فریب ہے جس کے ذریعہ سماج کے طبقاتی رجحانات کو غیر جانب داری کے دبیز غلاف میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

انقلابی نقاد صفائی کے ساتھ اقرار کرتا ہے کہ ادب اور آرٹ طبقاتی جنگ کا ایک کارگر حربہ ہے۔ برسر اقتدار طبقہ بھی اتنی ہی بے باکی کے ساتھ کہتا ہے کہ آرٹ کو حکومت کا ساتھ دینا چاہیے، ہندوستان کی آزادی کے بعد اردو کے بعض ادیبوں اور نقادوں نے قوم پرست مصنفین کے نام سے ایک انجمن بنانے کی کوشش کی تھی، جو حکومت کے "تعمیری کاموں" میں اس کا ہاتھ بٹاتی لیکن ابھی تک یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی ہے لیکن سرمایہ و محنت کے درمیان ڈانواڈول رہنے والے متوسط طبقے کے خوش پوش نمائندے دوسرے مسائل کی طرح شعر و ادب کے معاملہ میں بھی غیر جانبداری کا دم بھرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو طبقاتی جنگ سے بلند رہ کر اپنے خود ساختہ اصولوں پر ادب کو پرکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور مبہم اور متضاد باتوں کو رنگین اور خوشنما جملوں کے سہارے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے پر تھوڑی دیر کے لئے سکتہ کا عالم طاری ہو جاتا ہے

اگر ان ڈانواڈول رہنے والے نقادوں کے خیالات کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ متضاد اور بکھرے ہوئے خیالات کو خلط ملط کرکے ایک نئی شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی حالت قابل رحم ہے۔ یہ حاکم اور محکوم طبقے کے درمیان معلق ہوتے ہیں، اسی لئے کسی خاص فلسفہ زندگی کے حامل نہیں ہوتے بلکہ جو بات جس فلسفہ کی پسند آتی ہے اسے بٹور کر اپنا لیتے ہیں۔ زندگی کی قدروں کی تقابلی (اہمیت، ایک قدر کی دوسری پر افضلیت کا احساس زندگی میں مختلف طبقوں کی کشمکش ہی سے حاصل ہوتا ہے، غیر جانبدار نقاد طبقاتی امتیازات سے بلند رہتا ہے۔ اس لئے اس احساس سے بھی عاری ہوتا ہے۔ وہ سب ہی قدروں کو یکجا کر دیتا ہے۔ ان میں سے کون سی قدر بنیادی اور افضل ہے اور کون سی فروعی اور فروتر، وہ بتانے سے قاصر ہے۔ کیونکہ افضلیت اور اہمیت کے تعین کے لئے مخصوص نقطۂ نظر کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے یہاں یا تو مفقود ہوتا ہے یا عملی زندگی سے غیر متعلق ہونے کی وجہ سے مجرد اور کھوکھلا ہوتا ہے

آج زندگی جس ڈھب سے گذر رہی ہے اس کے پیش نظر عام انسان نہ صرف معاشی و سیاسی نظام میں ایک زبردست

تبدیلی کے خواہش مند ہیں۔ بلکہ اسے پیدا کرنے میں شعوری طور پر حصہ لے رہے ہیں۔ اسی لئے عوام اور ان سے ہمدردی رکھنے والے دانش ور جو خود بھی معاشی بدحالی، کا شکار ہو رہے ہیں۔ گل و بلبل سے زیادہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری، سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی حسن و عشق کی آویزش سے زیادہ انقلابی اور اس کی جوابی طاقتوں (مثلاً ہندو مسلم فسادات، قوم پرستی کے نام پر عوامی تحریکوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش) کی باہمی کشمکش سے متاثر ہے، بزم یار، اور محفل ناؤنوش میں اب اگلی سی جاذبیت نہیں۔ وہ پریشان ہیں کہ "ان دکھتے ہوئے شہروں فراواں مخلوق کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟" جب تک انسانوں کی کثیر تعداد مظلوم و مسلوب ہے ایسا ادب جو ایک محدود طبقہ کی فضیلت و برتری پہ استوار ہو گا۔ یقیناً اپنی اثر انگیزی کے اعتبار سے بھی محدود ہو گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس طبقہ کی زندگی کی طرح مصنوعی اور بے جان بھی ہو۔ مزدور اور درمیانی طبقے کے بیشتر لوگ "غم عشق" یا "خوش باشی و تنزیہ و تقدس" سے زیادہ اپنے حال میں مبتلا ہیں۔ وہ انقلابی تحریکوں مزدوروں اور طالب علموں کی ہڑتالوں سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ سردار جعفری، کیفی، اور ساحر جیسے شاعروں نے ان میں یہ رجحان پیدا کر دیا ہے بلکہ زمانہ کا تقاضا یہی ہے۔

انقلابی تحریکوں، مزدوروں اور طالب علموں کی ہڑتالوں کا تذکرہ سن کر اکثر لوگ چونک پڑتے ہیں کہ یہ تو ہنگامی موضوعات ہیں ان کو ادب سے کیا تعلق۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ آج طبقاتی کشمکش نے جو شدت اختیار کر لی ہے اس کی وجہ سے وقتی اور ہنگامی واقعات میر کی غریب الوطنی، تنگدستی، اور عریاں لفظی سے زیادہ وقیع موضوعات ہیں۔ اور اسی لئے ان کے اثرات برابر ادب میں سرایت کرتے جا رہے ہیں۔ موجودہ انقلابی ادب کے نمونے ابتداً مبہم، ادھورے اور خام تھے، ان میں دلکشی کم اور پروپگنڈا کا انداز زیادہ تھا۔ لیکن یہاں جوں جوں انقلابی یا ترقی پذیر طبقہ زور پکڑتا گیا۔ اس کے ادب میں طاقت اور توانائی پیدا ہوتی گئی، اس میں حسن، دلکشی اور تاثیر کا برابر اضافہ ہوتا گیا۔ ہر زمانہ کے ابھرتے اور آگے بڑھتے ہوئے طبقہ کے ادب کی ابتدا میں یہی شان رہی ہے، اردو شاعری کے پچھلے دس سال کے مختصر زمانہ کے انقلابی ادب کا سلسلہ ارتقا ہمارے سامنے ہے جس کے ایک سرے پر وقتی اور اشتعال انگیز نظمیں ہیں اور دوسرے سرے پر سردار جعفری کی طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ۳۷ء، ۳۸ء میں سردار کے قلم سے یہ نظم نہیں نکل سکتی تھی، اس لئے کہ اس وقت نہ عوامی تحریک میں پورے طور پر انقلابی شعور پیدا ہو سکا تھا۔ اور نہ سردار عوامی تحریک میں اپنی شخصیت کو پوری طرح تحلیل کر سکے تھے، سردار جعفری کے علاوہ بعض دوسرے انقلابی شعرا بھی ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں اب تک وہ تاثیر اور دلکشی نہ پیدا ہو سکی۔ شاید اسکی یہی وجہ ہے کہ عملی زندگی میں یہ تیسرا اپنے ہی طبقہ سے وابستہ ہیں اور ذہنی طور پر عوامی تحریک کو صرف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ عوامی زندگی کو اپنے تجربہ کی بنا پر نہیں بلکہ کتابیں اور رسالے پڑھ کر اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں اور اسی لئے ان کا کلام ناقص اور نکما ہوتا ہے۔ اکثر یہ بھی ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے کہ انقلابی ادب کو پیش کرنے والے ایسے ادیب ہیں جو انقلابی تحریک سے نئے نئے وابستہ ہوئے ہیں۔ وہ انقلابی پارٹی کی تجویز اور اخبار میں چھپی ہوئی رپورٹ کو موزوں کرتے یا افسانہ کا روپ دیتے ہیں۔ اس سے عوامی تحریک کا پروپگنڈا تو ضرور ہو جاتا ہے اور اس کی بھی اپنی جگہ ایک قیمت ہے لیکن اس سے عوامی ادب کی تخلیق نہیں ہو پاتی، مستعار خیالات کو قابل قبول بنانے کے لئے سیاسی اعلانات و تجاویز پر ادب کا مصنوعی رنگ چڑھانے اور اس طرح اسے مسخ کرنے سے بہتر ہے کہ وہ اپنے حقیقی تجربہ اور تاثر کو اپنے اندیشوں اور بدگمانیوں کو، اپنی حسرتوں اور خواہشوں کو ان خارجی حالات سے ہم آہنگ کر کے پیش کریں جو انھیں عوامی تحریک سے قریب ہونے پر مجبور کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے فیض یا مجاز نیم رومانی شاعر ہوتے ہوئے بھی ہر مصنوعی انقلابی شاعر سے زیادہ بہتر اور مخلص شاعر ہیں۔

آج انسان مشین کا غلام ہے اس لئے کہ مشین افراد کے قبضہ میں ہے۔ لیکن جب مشینوں پر سماج کا قبضہ ہو گا۔ جب

مشین کسی خاص طبقہ کی منفعت کے لئے نہیں بلکہ انسان کی ضروریات کو پورا کرنے اور سماجی فلاح وبہبود کو حاصل کرنے کے لئے چلائی جائیں گی جب انسان مشین یا مشین کے مالک کا دست نگر نہ ہوگا۔ اور جب انسان، انسان کا محتاج وغلام نہ ہوگا۔ اس وقت سماج غیر طبقاتی ہوگا اور اسی کے ساتھ ادب بھی۔ اس وقت ہم ایسے ادب کی تخلیق کر سکیں گے، جو کسی مخصوص طبقہ کا ترجمان نہ ہوگا۔ روس کا نیا سماج غیر طبقاتی سماج کا زندہ نمونہ ہے۔ جہاں کے عام رہنے والے ایک نئی زندگی کی تعمیر کر رہے ہیں، ادیب، عوامی ادب کی تخلیق میں اس نئی زندگی سے فیضان حاصل کرتے ہیں طبقاتی سماج میں رہنے والے شاید پورے طور پر سوچ ہی نہیں سکتے کہ روس کے انسانوں اور ادیبوں پر وہاں کی کایا پلٹ یا بنیادی تبدیلی کا کس قدر گہرا اثر پڑا ہے۔ جس نے اندھیرے کو اجالے میں۔ غربت کو فراغت میں، نقاہت کو توانائی میں مختصر یہ کہ جبر کو اختیار میں تبدیل کر دیا۔

جس طرح آج ہم اصلاحی دور سے گذر کر انقلابی دور میں آئے اسی طرح آئندہ ہم اس دور کو ختم کر کے عوامی دور میں قدم رکھیں گے، لیکن جدوجہد کے انقلابی مرحلے سے گذرنے کی وجہ سے ہمارا راستہ نسبتاً دشوار ہو گیا ہے۔ موجودہ دور جو پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے شروع ہوتا ہے ایک ایسا دور ہے جس کی رفتار کی تیزی اور کشمکش کی شدت ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ ہم فلسفہ وحیات، فکر وعمل اور قول وفعل کو اسی انقلابی دور کے پس منظر میں ہم آہنگ کریں، پچھلی دو جنگوں نے سرمایہ ومحنت کی آویزش میں جو تیزی پیدا کر دی ہے اس کے نتائج سامنے ہیں، ساری دنیا دو گروہوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک طرف غلام ملکوں کی جنگ آزادی ہے اور دوسری طرف امریکی اور برطانوی سرمایہ پرستوں کی سازشیں، زیر دست ایک طرف ہیں اور زبردست دوسری طرف۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ روس اور مشرقی یورپ کی بعض ریاستوں کو چھوڑ کر دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں پر دونوں قوتیں ایک دوسرے سے برسرپیکار نہ ہوں۔ یہ پیکار۔ جغرافیائی، قومی، نسلی، مذہبی، ہر قسم کی حد بندیوں کو عبور کر چکی ہے، ایک طرف دنیا کے سرمایہ دار ماضی کو سینہ سے لگائے اور حال پر پنجہ جمائے سنبھالا لینے کی کوشش کر رہے ہیں اور دوسری طرف دنیا کے مظلوم ومسلوب لیکن آگے بڑھتے ہوئے عوام۔ جن کی آنکھوں میں ماضی کا جادو، حال کا عزم اور مستقبل کا نور، ہے، حال کی لعنتیں سہہ کر خوشگوار مستقبل کی تخلیق کر رہے ہیں۔ اس طرح رجعت ایک طرف ہے تو ترقی دوسری طرف، تخریب ایک طرف ہے تو تعمیر دوسری طرف۔ عوامی طبقہ ہمارے زمانہ کا ترقی پسند طبقہ ہے جو اپنی زندگی کے حالات سے مجبور ہو کر زندگی کو زیادہ وسیع نقطہ نظر سے دیکھنے پر مجبور ہے، اس لئے زندگی اور اسی کے ساتھ ادب کی ارتقا اسی طبقہ کے ساتھ وابستہ ہے، غیر طبقاتی سماج کو وجود میں لانے سے پہلے، جس میں انسان ضرورت، محرومی، اور انسانی امتیازات کے چکر سے نکل کر کھلی فضا میں فراغت اور آزادی محسوس کر سکے اور غیر طبقاتی ادب کی تخلیق کر سکے، ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں کو خواہ وہ عوام سے ابھرے ہوں یا دوسرے طبقوں سے آکر ان میں شامل ہوئے ہوں، ایک ایسے ادب اور آرٹ کی تخلیق کرنی ہے، جو بیک وقت انقلابی بھی ہو اور تعمیری بھی ہو، مقامی بھی ہو اور عالمگیر بھی، جو اپنی شعاعوں سے ساری دنیا کو جگمگا سکے، جس کی شعاعوں میں چاندنی کی ٹھنڈک بھی ہو اور آگ کے شعلے بھی۔ جس کی روشنی پھیل کر زندگی کے ہر پہلو کے تاریک گوشوں کو روشن کر سکے اور ان میں نئی حرکت اور نئی زندگی پیدا کر سکے۔

کیفی اعظمی

انقلاب چین

ساتھیو! سرخ پھریرا لہراؤ، سرخ شرارے بھڑکاؤ، اور جہاں پر چھا جاؤ

آج صدیوں کی جمی برف پہ جلتا ہے الاؤ — سینۂ شرق کی یہ آگ فلک تک پہونچاؤ
ہر جگہ چین کی جرأت کا فسانہ دہراؤ — کہیں بجلی کہیں آندھی، کہیں طوفاں بن جاؤ

ساتھیو! سرخ پھریرا لہراؤ، سرخ شرارے بھڑکاؤ، اور جہاں پر چھا جاؤ

ویت نام اور ملایا کی زمیں جاگ اٹھی — دفعتاً چونک کے برما کی زمیں جاگ اٹھی
وندھیاچل کی ہمالہ کی زمیں جاگ اٹھی — ایشیا جاگ اٹھا زندہ دلو جشن مناؤ

ساتھیو، سرخ پھریرا لہراؤ، سرخ شرارے بھڑکاؤ، اور جہاں پر چھا جاؤ

کھینچ کر دہر کی پہنائی میں چاندی کی لکیر — منڈیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں اجارے کے سفیر
اپنی ہی کڑیوں سے الجھی ہے سنہری زنجیر — اپنے مرکز ہی سے ٹکراتا ہے زر کا پھیلاؤ

ساتھیو! سرخ پھریرا لہراؤ، سرخ شرارے بھڑکاؤ، اور جہاں پر چھا جاؤ

کارخانوں کا یہ بھونچال یہ کھیتوں کا جلال — خونِ جمہور میں یہ جوش یہ گرمی یہ ابال
یہ تفنگیں یہ درانتی، یہ ہتھوڑے یہ کدال — بڑھ کے سونے کے ہر ایوان پہ لوہا برساؤ

ساتھیو سرخ پھریرا لہراؤ، سرخ شرارے بھڑکاؤ اور جہاں پر چھا جاؤ

کشمکش چہرۂ ہستی کی بڑھا دیتی ہے آب — زندگی جہد کے میداں میں الٹتی ہے نقاب
یہیں نکھرے گی محبت یہیں اٹھے گا شباب — آج جس راہ پہ ہوتا ہے لہو کا چھڑکاؤ

ساتھیو! سرخ پھریرا لہراؤ، سرخ شرارے بھڑکاؤ اور جہاں پر چھا جاؤ

نانکن جن کی جدائی میں تھا کل شعلہ بہ جاں — آج کس شان سے چلتے ہیں سفر سے وہ جواں
آہنی ہاتھ میں تاریخ کے مرکب کی عناں — سیل رفتار میں گم وقت کے دھارے کا بہاؤ

ساتھیو سرخ پھریرا لہراؤ، سرخ شرارے بھڑکاؤ، اور جہاں پر چھا جاؤ

کہنہ دیوار سے رکتا ہے کوئی سیل حیات — عہد نو آہی گیا لے کے نئے دن نئی رات
جھلملاتا ہوا پلکوں پہ یہ خواب سن یات[۱] — مسکراتی ہوئی آنکھوں میں یہ چالاکئ ماؤ[۲]

ساتھیو! سرخ پھریرا لہراؤ، سرخ شرارے بھڑکاؤ، اور جہاں پر چھا جاؤ

[۱] چین کے جمہوریت پرست لیڈر ڈاکٹر سن یات
[۲] کامریڈ ماؤزے تنگ

یہ سرافراز مشینیں یہ لہکتا ہوا دھان — کامگاروں سے گلے ملتے ہیں ہنس ہنس کے کسان
ڈھ گئے قصر کبھی لگتا تھا جن میں کھلیان — آج ہر موڑ پہ ہر گام پہ کھلیان لگاؤ

ساتھیو! سرخ پھریرا لہراؤ، سرخ شرارے بھڑکاؤ، اور جہاں پر چھا جاؤ

توڑ دیتا ہے روایات، جہادِ پیہم — سرنگوں آج ہے ابلیس حضورِ آدم
رکھ دئے ظلم کے مرکز پہ دلیروں نے قدم — بھر گئے سینۂ گیتی کے سلگتے ہوئے گھاؤ

ساتھیو! سرخ پھریرا لہراؤ، سرخ شرارے بھڑکاؤ، اور جہاں پر چھا جاؤ

مسکراتی ہوئی بڑھتی ہے جدھر سرخ سپاہ — فتح، ڈالر کے پہاڑوں میں بنا دیتی ہے راہ
سازشیں چین کے سیلاب کی پاتیں نہیں تھاہ — چیانگ کو لے کے الٹتی ہے ٹرومین کی ناؤ

ساتھیو! سرخ پھریرا لہراؤ، سرخ شرارے بھڑکاؤ، اور جہاں پر چھا جاؤ

چین عسرت کا محل راہزنی کا مسکن — خانہ جنگی کی کمیں گاہ، غلامی کا وطن
زرد ماتھے پہ مچلنے ہی لگی سرخ شکن — خون کھانے ہی لگا سینۂ افلاس میں تاؤ

ساتھیو! سرخ پھریرا لہراؤ، سرخ شرارے بھڑکاؤ، اور جہاں پر چھا جاؤ

بوند ٹپکی ہے شہیدوں کے لہو کی جن پر — آج ان خاک کے ذروں سے ابلتے ہیں شرر
ندیاں بھاگنے والوں کی پکڑتی ہیں کمر — وادیاں کرتی ہیں دشمن کی صفوں پر پتھراؤ

ساتھیو! سرخ پھریرا لہراؤ، سرخ شرارے بھڑکاؤ، اور جہاں پر چھا جاؤ

ڈھل کے شعلوں میں زمیں تنگ ہوئی جاتی ہے — سانس ایٹم کے سپوتوں کی گھٹی جاتی ہے
تیسری جنگ کی اک شکل مٹی جاتی ہے — تیسری جنگ کی ہر شکل ہر اک نقش مٹاؤ

ساتھیو! سرخ پھریرا لہراؤ، سرخ شرارے بھڑکاؤ اور جہاں پر چھا جاؤ

حبیب تنویر

انقلاب چین

(اس نظم کے چند بند دوسری جگہ شائع ہو چکے ہیں۔ نیا ادب میں مکمل نظم چھاپی جا رہی ہے)

یہ چین سے خبر ملی ہے خوشگوار ساتھیو
کہ وہ شہید جان و دل لٹا کے کامیاب ہے
جو مادر وطن کی جان کا امین ہو گیا
ہے خاک دہر لالہ کار جس کے خون گرم سے
اسی کا قلب زار محور زمین ہو گیا
ہے کس قدر فسوں نواز گوش انتظار کو
یہ انقلاب جو صدائے ارض چین ہو گیا
یہ ہند کا یہ ایشیا کا کار زار ساتھیو

کروڑوں آنکھیں سیکڑوں برس کی نیند سے کھلیں
وہ دست ہائے بے بسی کی یک بیک رگیں تنیں
جو کل وبال دوش تھیں وہ خستہ گردنیں اٹھیں
لئے ہوئے خموں میں تیرا افتخار ساتھیو

پناہ مانگتی تھیں مفلسی سے جن کی عصمتیں
صفوں پہ دشمنوں کی نعرہ زن ہیں اب وہ عورتیں
چمک اٹھی ہیں سرخ پرچموں میں ان کی زینتیں
یہ سرخیاں انھیں کے خون کا نثار ساتھیو

ستارہ ہائے سرخ موزئے تنگ لازوال ہیں
سپاہیوں پہ آج ان کے وار بے مثال ہیں
جو زر خرید ہیں وہ رہنما خراب حال ہیں
ہے دشمنوں کی فوج میں وہ انتشار ساتھیو
وہ فخر کا نفوسیس مجاہدان صف شکن

حریف ذات عیسوی شہید غیرت وطن
نثار جس پہ کربلا پڑا ہے چین میں وہ لن
وہ اڑ گیا سر یزید نابکار ساتھیو

وہ شیر کاغذی جو سرخ لشکروں کے زیر تھے
غبار خاک رفتگاں جو اٹھ گیا تو ڈھیر تھے
جدھر جدھر نگاہ اٹھ گئی ادھر دلیر تھے
جنھیں نہیں تھا بیس سال سے قرار ساتھیو

وہ بزدلوں کی فوج ڈالروں سے جو بدل گئی
جو عین وقت رزم ہیجڑوں کی چال چل گئی
پناہ مانگنے کو سوئے ملک مارشل گئی
کہ تیر ہو چکا ہے اب جگر کے پار ساتھیو

ہوس پہ روح نفع خور کو ابھارتے رہے
افیم کھا کے بوتلوں میں جن اتارتے رہے
تجارت ضمیر و دل کو جو سنوارتے رہے
وہ اہل زر وہ ان کا زعم خود شکار ساتھیو

مدد مدد پکارتی ہیں آج جن کی صورتیں
بلا کے مارشل کو چہ چلوں کو اب وہ دیکھتیں
نکل سکیں کدال کی جو ضرب سے تو ہم کہیں
ہے بال سے مہین اس کی تیز دھار ساتھیو

ہے گلشن حیات جاوداں ہیں جن سے رنگ و بو
وہ تیز رو سبک قدم جفاکشان جنگ جو
ملوں سے کھیت کھیت سے بڑھا وہ سیل تندخو
اب اس بلا میں خار و خس کا کیا شمار ساتھیو

برس رہی ہیں آسمان پر زمیں سے بجلیاں
فضاؤں میں اچھل رہے ہیں بیلچے کلہاڑیاں
اگی ہوئی ہیں چمن سے گرتیں تک درانتیاں
زمیں پہ ہے رگوں کے تار کا حصار ساتھیو

وہ جس نے پنجہ تاجران چین کا مروڑا ہے
وہ جس نے جوئے شیر بائی ہے پہاڑ توڑا ہے
وہ جس کے دوش پہ کدال ہاتھ میں ہتھوڑا ہے
وہ آدمی ہے ارتقا کا شاہکار ساتھیو

وہ زخم دل تھی جس کے زہر سے حیات مضمحل
جو ریزہ ہائے تیغ اہل زر سے کل تھا منفعل
ابھر رہا ہے سینۂ جہاں پہ ہو کے مندمل
قضا کے گھاٹ اتر رہے ہیں شہر یار ساتھیو

وہ جذب ہو کے اب زمیں کا دل ٹٹولنے لگا
وہ ظلمتوں کو پی کے اب ستارے رولنے لگا
وہ دوڑنے لگا وہ پھر رگوں میں بولنے لگا
شہید زہر غم کا خونِ بے قرار ساتھیو

چمن چمن کا آج غنچہ غنچہ شعلہ بار ہے
خزاں کو انقلاب گلستاں کا اعتبار ہے
نظر کو انتظار حسن آمد بہار ہے
ہوئے ہیں مشکبار گیسوے تتار ساتھیو

چمک اٹھی تمدن قدیم چین کی جبیں
دمک رہے ہیں اشتراکیت کے تاج کے نگیں
عوام کے افق کے سورجوں میں آ گئی زمیں
ہے کن بلندیوں پہ خاک زرنگار ساتھیو

ہوئی ہے سربلند خاک چین و انڈونیشیا
جمی ہوئی ہے تابکن پہ اب نگاہ ایشیا
یہ زرگری کہنہ یہ ہوس پرست ویشیا
بہت اٹھا چکی ہے زندگی کا بار ساتھیو

پیمبر ضیائے حریت فضائے چین ہے
مجاہدوں کو فتح انقلاب کا یقین ہے
کہ سرخ ملک چین سے دکن تلک زمین ہے
یہ کرب و درد جستجو یہ خلفشار ساتھیو

صدائے چین اور صدائے ہند آج ایک ہے
شکار مرگ اب ہر ایک چیانگ کائی شیک ہے
بنا رہی ہے وقت کی روش کی سال نیک ہے
بدل دیں رخ ہوا کا مل کے ایک بار ساتھیو

اس آسمان سرخ اس زمین سرخ کی قسم
دل وجود میں نئے جنم کا پیچ و تاب ہے
یہ انقلاب چین تازیانۂ حیات نو
نشیمن شب گراں پہ برق آفتاب ہے
یہ دم بدم سحر کے لشکروں کی خوفشانیاں
نشان سرخ اٹھاؤ ساتھیو یہ انقلاب ہے
اٹھو کہ چرخ مفلسی ہو برق بار ساتھیو
حیات جاوداں پہ جان و دل نثار ساتھیو

(انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی میں پڑھی گئی)

عصمت چغتائی

بہو بیٹیاں

یہ میری سب سے بڑی بھابی ہیں۔ میرے سب سے بڑے بھائی کی سب سے بڑی بیوی، اس سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ میرے بھائی کی خدا نہ کرے بہت سی بیویاں ہیں۔ ویسے آپ اگر اس طرح سے ابھر کر سوال کریں تو میرے بھائی کی کوئی بیوی نہیں۔ وہ اب تک کنوارا ہے۔ اس کی روح کنواری ہے۔ ویسے دنیا کی نظروں میں وہ بڑی بھابی کا خدائے مجازی ہے اور پون درجن بچوں کا باپ ہے۔ اس کی شادی ہوئی، دولہا بنا، گھوڑے پر چڑھا۔ دلہن کو گھر لاکر پلنگ پر بٹھایا۔ پھر پاس ہی خود بھی بیٹھ گیا۔ اور جب سے برابر بیٹھ رہا ہے لیکن تصوف کی باتیں سمجھنے والوں کو ہی معلوم ہے کہ وہ کنوارا ہے اور صدا کنوارا رہے گا۔ اس کا دل نہ بیاہ سکا اور نہ کبھی بیاہ سکے گا۔ وہ نہ کبھی دولہا بنا نہ گھوڑے چڑھا، نہ دلہن کو لایا نہ اس کے سنگ اٹھا بیٹھا۔ وہ تو اس کا باپ تھا جس نے اس کا بیاہ طے کیا، ایرے غیرے نتھو خیرے کی رائے سے۔ وہ بغاوت کے انجار میں جھلستا رہا۔ مگر چوں نہ کر سکا، کیونکہ وہ جانتا تھا اس کے باپ کے ہاتھ بڑے تگڑے ہیں اور جوتے اس سے بھی تگڑے اس لئے اس نے بہتر سمجھا کہ وہ شہید تو ہو ہی رہا ہے جوتے سے شہید نہ ہو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لہذا وہ دولہا بنا اور سہرے کے پیچھے تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ ایک اور سہرا بندھا ہے، جو اس کے ارمانوں کے خون میں ڈوبے ہوئے آنسوؤں سے گوندھا گیا ہے، جس میں اس کی نہ سنائی دینے والی سسکیاں پروئی ہوئی ہیں۔ جن میں اس کے مسلے ہوئے جذبات اور کچلی ہوئی حسرتیں بندھی ہوئی ہیں۔ وہ گھوڑے پر نہیں چڑھا، اس کی میت ماں باپ کی ہٹ دھرمی کے گھوڑے پر لٹکا دی گئی، وہ اپنی دلہن نہیں لایا بلکہ وہ ماں باپ کی دلہن تھی انہیں کی بیاہتا تھی،

مگر ایک مجبور بیٹے کی طرح بنا آہ و زاری کئے وہ دلہن کے پاس بھی گیا۔ اس کا گھونگھٹ بھی ہٹایا۔ مگر وہ یہی ارادہ کر چکا تھا کہ وہ خود وہاں نہیں یہ اس کا باپ ہے جو اس دلہن کا دولہا ہے۔ مگر چونکہ میری بھابی اس وقت بڑی نہ تھی، میرا مطلب ہے جسمانی طور پر وہ دبلی پتلی اور نازک سی چھوکری تھی، اس لئے ایک لمحہ کو میرے بڑے بھائی کا جسم اس سے بیاہ گیا۔ لیکن بہت جلد ہی وہ دبلی پتلی عورت بڑھنا شروع ہوئی، اور چند سال ہی میں وہ پھول پھال کر بے تکے گوشت کا ڈھیر بن گئی۔ میرے بھائی نے اس کے اوپر چڑھتے ہوئے گوشت کو نہ روکا۔ اس کی جوتی رو گئی۔ وہ اس کی تھی کون۔

لیکن وہ بچے ... ... اس کے ماں باپ کے بچے جنہیں وہ کبھی بھولے سے بھی نہ چھوتا تعداد میں بڑھتے رہے ناکیں سر سڑاتے، میلی ٹانگیں اچھالتے واویلا مچاتے مگر میرے بھائی کے دل کے دروازے ویسے ہی بند ہے وہ ایسا ہی کنوارا اور بانجھ رہا بڑی بھابی کچھ ایسی ان مرحلوں میں پھنس کر اس نے پلٹ کر بھی بھیا کی طرف نہ دیکھا۔ جانے کہتی ہوں، میں تو پہلے ساس سسر کی بہو ہوں، ننڈ کی بھاوج ہوں، بچوں کی اماں ہوں نوکروں کی مالک ہوں، محلے ٹولے کی بہو بیٹی ہوں، پھر اگر وقت ملا تو تمہاری بیوی بھی بن جاؤں گی۔

بھیا کو اس طرح کی ساجے کی ہانڈی بڑی پھیکی سیٹھی اور بے مزہ لگی اور اس نے اپنا دل سنبھال کر اٹھایا، بکھرے ریزے سمیٹے اور تلاش میں نکل کھڑا ہوا، اس نے کتنے ہی آستانوں پر اس چکنا چور شیشے کے ٹکڑے کو جا کر رکھا۔ مگر کوئی مرہم کوئی دوا ایسی نہ ملی جو ان ریزوں کو جوڑ دیتی، اس لئے وہ اب بھی اپنا کنوارا دل لئے پھر رہا ہے، کسی دل والی کی تلاش میں۔

اس نے دل والیوں کو رنڈیوں کے کوٹھوں پر ڈھونڈا۔ گندی گلیوں میں گھومنے والی تکھیائیوں میں تلاش کیا۔ ریڈیو اسٹیشنوں پر گانے والی حسیناؤں پر گانے والی اور آرٹسٹوں میں ٹٹولا، ہسپتالوں کی نرسوں میں بھی جستجو کی، فلمی پریوں کی گپھاؤں میں بھی بھٹکا۔ اور اکسٹرا لڑکیوں کے جھرمٹ میں بھی جھانکا، جاہل گاؤں کی گنواریوں، سڑک کی کوٹنے والیوں، بھیرنوں اور بھٹیاریوں کے آگے بھی ہاتھ پھیلایا۔ ڈرائنگ روم میں اگنے والی اور بال روم میں تھرکنے والی شریف زادیوں سے بھی بھیک مانگی مگر اسے دل والی کہیں نہ ملی، لاکھوں ہی گھونگٹ پلٹ ڈالے مگر وہی عورت، وہی، ساس سسر کی بہو، وہی ان کے ہی بال بچوں کی ماں دکھائی دی۔

میری بھابی سب سے بڑی سہی، مگر زیادہ عقلمند ہرگز نہیں اس نے میاں کو جھوٹے بہلاوے کبھی نہ دئے۔ جیسے پہلے ہی رات کو وہ سمجھ گئی ہو کہ اپنی جان گھسانا حماقت ہے ان تلوں سے تیل نہ نکلے گا۔ اور وہ دنیا سے جی کڑا کر کے کالے کلوٹے، ٹیڑھے بھینگے بچے تو خود بخود اس کے پیٹ میں تعمیر ہوتے رہے وہ تو ابکائیاں لینے اور بد وضع بننے کے سوا کچھ بھی نہ کرتی رہی۔ اور یہ بچے میرے بھیا سے انتقام لینے کا مفید آلہ کار ثابت ہوئے، جب ناک جاٹتے، ننگ دھڑنگ بسورتے ہوئے کینچوے کسی محفل یا پارٹی میں میرے بھیا کو چھو دیتے ہیں تو وہ ایسے اچھل پڑتے ہیں۔ جیسے بچھو نے ڈنک لیا ہو، اور جب کبھی بھولے سے کوئی احمق مہمان گھر میں گھس جاتا تو یہی تہذیب اور لطافت کے قاتل ادب اور سلیقہ کے دشمن اس کی چھاتی پر کود دل کر اس کو ڈوب مرنے کی ترغیبیں دیا کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ گھر کے میلے بچھونے میلے فرش اور چھپلا مڑے برتن ایک نفیس و نازک روح کو ابدی مرگھٹ میں سلگانے کے لئے کافی نہ پا کر میری بھابی نے چلہ ترکیبوں اور خوش گفتاریوں کے زریں نسخے استعمال کر کے آنے جانے یا مستقل رہنے کے شوقین رشتہ داروں کا سلسلہ بھی منقطع کر دیا ہے۔

اسی لئے تو بچارہ دل والی کی تلاش میں در در مین لٹا پھرتا ہے۔ کبھی کبھی اسے کوئی محبوبہ دلنواز مل ہی جاتی ہے۔ وہ اسے لے کر ایک نئے بنگلے میں ایک نئی امید کے بھروسہ پر ایک نئی دنیا بنا ڈالتا ہے۔ مگر اس بوسیدہ محور پر گھومنے کی عادی یہ نئی دنیا جلد ہی پرانی ہو جاتی ہے۔ وہ محبوبہ دلنواز موقع پا کر اس کا فرنیچر فروخت کر کے، مکان گروی پر اٹھا کر حتیٰ کہ اس کے کپڑے بھی اپنے نئے عاشق کے لئے لے کر بھاگ جاتی ہے اور وہ پھر ویسا ہی لنڈورا اور یتیم رہ جاتا ہے۔

ویسے بھی اسے عشق راس نہیں آتا جہان کے لوگ آوارگی کرتے ہیں۔ یہ گھنٹیاں کسی کے گلے میں نہیں لٹک جاتیں۔ وہ تو اگر بھولے سے کسی کی طرف مسکرا کر بھی دیکھ لیا تو وہ عورت فوراً ”حاملہ ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جان پر ایک عدد تحفہ نازل کر دیتی ہے۔ جسے وہ بلّی کے گو کی طرح جگہ جگہ چھپاتا پھرتا ہے۔ وہ اپنے جائز بچوں سے ذرا نہیں شرماتا مگر اس کی علتوں سے اس کی عزت پر حرف آنے کا خوف ہے، وہ بڑا باعزت ہے نا۔

وہ اپنی اس مصیبت کو دنیا کی سب سے بڑی آفت سمجھتا ہے۔ جب اس کے دل کی دنیا اجاڑ پڑی ہے تو لوگوں کو بھوک مہنگائی اور بے کاری جس میں بے مصرف چیزوں کے بارے میں کچھ سوچنے کا کیا حق ہے۔ دل ہے تو سب کچھ ہے،

آپ سمجھیں گے کہ وہ کوئی جنسی مریض ہے، عورت کا بھوکا ہے۔ جی نہیں اس ظالم عورت کی وجہ سے تو اسے بارہا شدید قسم کی بدہضمی بھی ہو چکی ہے تو بات دراصل یہ ہے کہ وہ ایسے ماحول کی پیدائش ہے جہاں غم دنیا کو غم عقبیٰ کی آڑ میں چھپانا سکھایا جاتا ہے۔ جہاں ہر جسمانی محرومی کا الزام نصیب کے سر اور روحانی تشنگی کا ٹھیکہ معشوق کے ذمہ وہ قسمت کے پیچھے ڈنڈا لے کر پڑا ہوا ہے، ایک دن اسے نصیب کہیں دبکا ہوا مل جائے گا۔ اور وہ اس کا سر پاش پاش کر دے گا۔ پھر وہ ہوگا اور اس کی محبوبہ، لیکن اسے اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس کا نصیبا اس کی

پیٹھ پر بیٹھا ہے اور اس کی چربی چڑھی آنکھوں کو کبھی نظر نہ آئے گا۔

اور ان کڑوے کسیلے ماں باپ اور فرسودہ نظام کے سائے میں پون درجن بچے پروان چڑھ رہے ہیں۔ اُٹنے والی بو داغ رہی ہے اور زندگیاں سانچوں میں ڈھل رہی ہیں۔ نامعلوم منزل گھسٹنے کے لئے۔ دنیا میں تلخی اور افلاس کی بال پوس کرنے کے لئے۔

یہ میری دوسری بھابی ہے، میرے بھائی کی انمول دلہن اس کی قسمت کا چکتا دمکتا سورج اس کی مشعل راہ۔ میرا بھائی بڑا ہی تقدیر والا ہے۔ اس نے ایک غریب گھر میں جنم لیا، دیوں کی ادھ مری روشنی میں پڑھ پڑھ کر ایک دن جب روشن ستارے کی طرح جگمگانے لگا تو ایک بڑی سی مچھلی آئی، اور اسے ثابت نگل گئی۔

جوں ہی اس نے اوّل نمبروں سے بی۔ اے پاس کیا، نواب گھمن کی نظر التفات اس پر پڑ گئی، نہ جانے کدھر کے رشتہ ناطے جوڑ توڑ کر پروفیسروں کے ذریعہ کا نشانہ مارا، اور دیکھتے ہی ایک چھوڑ ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گئے، پھر اسے اپنی سب سے چہیتی باندی کی سب سے لاڈلی بیٹی کو بخش دیا۔ باوا بہتیرا پھڑکے مگر ایک طرف تو تنی نواب زادی اور انگلینڈ جانے کا خرچہ اور دوسری طرف کھوسٹ باپ اور اپاہج ماں اور بن بیاہی بہنوں کی پلٹن کی پلٹن اور ادھ بڑھے بھائیوں کی فوج۔ ظاہر ہے کہ بازی بڑے حلق والی مچھلی کے ہاتھ رہی، اور بقیہ جونکیں منہ دیکھتی رہ گئیں۔ چٹ منگنی، پٹ بیاہ اماں کو سمدھن بننے کا شوق، بہنوں کو نیگ اڑانے کی تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی، اور پوت پتنگا بن کر سات سمندر پار اڑ گیا۔

اماں نے جی پر پتھر رکھ لیا تھا کہ بلا سے ہڈی نیچی ہے تو جہیز ہی سے آنسو پچھ جائیں گے، ماشاء اللہ اتنے سامان سے پلٹن کے دو چار سپاہی تو لیس ہو جائیں گے۔ دولہا کی سلامی سے ہی دو تین بھائیوں کی ناؤ پار اتر جائے گی، مگر سارے ارمان سارے چوچلے پھر سے اڑ گئے، جب نواب کی ایک کوٹھی دلہن کا بانکا اور دوسری کوٹھی سسرال بنی اور بہو ایک کوٹھی سے دوسری کوٹھی کو بیاہ دی گئی۔

انگلینڈ سے لوٹ کر دولہا بیاہ کر سسرال چلا گیا اور اماں باوا نئے سرے سے دوسرا پودا سینچنے پر جٹ گئے۔ پھر کسی دن اس پودے کے چکنے چکنے پات کسی باغباں کو نظر آ گئے تو وہ اسے بھی اس گھورے سے سمیٹ کر اپنے "سرہاؤس" میں لے جا کر رکھ دیگا اور اماں باوا ایڑیاں رگڑتے، آخری منزل کو جا کر پکڑ لیں گے۔

اب یہ پہلا پودا اپنے سسر کی ریاست میں کسی مفت خوروں والے عہدے پر فائز ہے۔ علاوہ تنخواہ کے موٹر گھوڑا گاڑی، کوٹھی بنگلہ، نوکر، چاکر اور ایک عدد نواب زادی اسے ملی ہوئی ہے۔ صبح اٹھ کر دربار میں نمن سلام جھاڑ چکنے کے بعد وہ دن بھر پڑا کوٹھی میں اینڈتا ہے۔ کبھی کبھی اسے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی حیثیت افزائش نسل کے لئے استعمال کئے جانے والے سانڈ سے زیادہ نہیں جو تھان پر بندھا اگلی ہوئی نئے کی جگالی کئے جا رہا ہے۔

اس کی بیوی یعنی نواب زادی کبھی اس کے غلیظ گھر نہ آتی، مگر جب بوڑھے باپ نے دنیا کی جنگ سے عاجز آ کر ہتھیار ڈال دئے تو وہ مع اپنے پورے نام جھام کے دو گھڑی کو آئی، اس وقت بے چارے نوابی داماد کی شرم کے مارے بری حالت ہو گئی، جیسے گورنر وائسرائے کی سواری آ رہی ہو تو ایک صاف سی سڑک چن کر جھنڈیاں لگا دی جاتی ہیں تاکہ وائسرائے سمجھے کہ سارا ملک ایسا ہی صاف اور جھنڈیوں سے سجا ہوا ہے اس طرح گھر کا سارا کوڑا کرکٹ نظروں سے اوجھل رکھ دیا گیا۔ میت اٹھنے سے پہلے ہی نواب زادی اٹھ کر چل دیں اور ساتھ ساتھ وہ داماد بھی۔

مگر بڑے حساس دل کا مالک ہے وہ سب کچھ سمجھتا ہے اور اس کے دل پر برف کے گھونسے ہر دم لگا کرتے ہیں۔ اس لئے

وہ جلد از جلد اس ماحول میں سمونے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور خود فراموشی کے لیے شراب پیتا ہے، تب وہ سب کچھ بھول جاتا ہے یہ بھی بھول جاتا ہے کہ سہانے موسم آگئے ہیں اور آس پاس کی ریاستوں کے رنگین مزاج سیر و شکار کو آ جا رہے ہیں اس کی بیوی دوسری نواب زادیوں کی طرح ہرنی بن کر چوکڑیاں بھر رہی ہے وہ خود تین سلام جھاڑ رہا ہے۔ آرام دہ کمرے میں سر و پیر سے بے خبر پڑا ہے، اب تو اسے اپنی رفیق زندگی کی آنکھوں میں سے گذرتے ہوئے سوال بھی نہیں جگا سکتے۔ وہ یہی تو کہتی ہے کہ "تمہارا مصرف کیا ہے؟ میرے باپ کی جلد بازی نے تمہیں اس جنت ارضی میں لا ڈالا ہے، اسے غنیمت جانو۔ جو یہ نہ ہوتا تو جوتیاں چٹخاتے پھرتے" ایسے موقع پر اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ دنیا کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دے پٹخے اور . . . . . .

مگر وہ اس خیال کو اپنے دماغ میں جڑ پکڑنے سے پہلے اکھاڑ پھینکتا ہے، دنیا جانتی ہے کہ وہ انگلینڈ سے کوئی ڈگری یا ڈپلوما تو لا نہ سکا۔ اس کے جاتے ہی صاحبزادی صاحبہ کو دل کے دورے پڑنے لگے اور انھوں نے رو رو کر اسے واپس بلوا لیا اس لئے بیچارے کی حالت ایسی نیم پخت روٹی جیسی ہے جو قبل از وقت توے سے پھسل کر گھی میں آن گری ہو، اوپر سے کاہلی اور بے کاری کی بھبھوندنے اسے اور بھی بے مصرف بنا دیا۔ وہ ایر کنڈیشن کمروں میں سو سو کر اپنی پرانی کچی کھپریل سے کانپنے لگتا ہے، فلش کا عادی ہو کر اسے غلیظ کچے سنڈاس کے خیال سے بخار چڑھتا ہے اس کی قسمت کا ستارہ بلندیوں پر ٹمٹما رہا ہے، جسے پکڑنے کے لئے وہ آوارہ بگولے کی طرح سرگرداں ہے،

اور جب وہ بہت تھک جاتا ہے تو غصہ میں آکر وھسکی کی مقدار پیگ میں دوگنی کر کے پر سکون جمائیاں لینے لگتا ہے یہی اس کی کشمکش ہے اور یہی زندگی کی جد و جہد، نمک کی کان میں جا کر وہ بھی تو نمک کا کھنبہ بن چکا ہے،

جب ان نمک کی کانوں پر پھاوڑوں کی چوٹ پڑے گی اور ان کے پرخچے اڑا کر روٹیوں میں گوندھ ڈالے جائیں گے تو اس خاص نمک کے توے کی روٹی نمکین نہیں بلکہ کرکری ہوگی۔ پھر اس کرکری روٹی کا نوالہ بھی تھوک دیا جائے گا۔

میری ایک اور بھابی بھی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ کہلاتی ہے، اسے ایک کامیاب بیوی بننے کی مکمل تعلیم ملی ہے، وہ ستار بجا سکتی ہے، پینٹنگ کر سکتی ہے، ٹینس کھیلنے، موٹر چلانے اور گھوڑے کی سواری میں مشاق ہے۔ بچوں کی پرورش آیا سے بخیر و خوبی کروا سکتی ہے۔ بیک وقت سو ڈیڑھ سو مہمانوں کی آؤ بھگت کر سکتی ہے۔ میرا مطلب ہے، بیرا اوگ کو اپنی نگرانی میں لے کر، بڑے لاڈ پیار سے اس کی کانوینٹ میں تربیت ہوئی، اور جب خدا رکھے سن بلوغ کو پہنچی تو اس کے روشن خیال والدین نے اس کے حضور میں ہونہار امیدواروں کی ایک رجمنٹ کو پیش ہونے کی اجازت دے دی۔ ان میں آئی سی ایس بھی تھے اور پی۔ سی ایس بھی حسین اور تعلیم یافتہ بھی تھے، بدصورت اور دو دھاری گائیں بھی اشرفیوں کے تھیلوں کے ساتھ ساتھ منہ کا مزہ بدلنے کو کچھ ادیب بھی اور شاعر بھی، اور پھر اس سے کہہ دیا کہ بیٹی تیرے آنکھیں بھی ہیں اور ناک بھی، خوب ٹھوک بجا کر ایک بکرا چھانٹ لے۔

سو اس نے خوب جانچ پڑتال کر کے ایک اپنے ہی پلے کا بھاری بھرکم چن لیا اور اس پر عاشق ہو گئی، جس کی داد اس کے والدین نے عظیم الشان جہیز کی صورت میں دی۔

لوگ اس ہنس ہنسنی کے جوڑے کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اور وہ بھی شدت الفت سے بے تاب ہو کر ایک دوسرے کو "ڈارلنگ" کہتے ہیں۔

دونوں میاں بیوی ایک ہی فرمے کے بنے ہوئے ہیں، ان کے مزاج یکساں پسند اور ناپسند یکساں، غرض ہر

بات یکساں ہے۔ دونوں ایک ہی کلب کے ممبر ہیں، دونوں ایک ہی سوسائٹی کے چہیتے فرد۔۔۔۔۔ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے یہی وجہ ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے اتنی شدید قسم کی نفرت ہے، وہ بہنیں ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھتے۔ فرصت ہی نہیں ملتی۔

میاں کا ایک دوسرے اعلیٰ افیسر کی بیوی سے مشہور و معروف قسم کا عشق چل رہا ہے، اور بیوی اس کے ایک ہم عمر سے مانوس ہے جس کی بیوی اپنی سہیلی کے میاں سے اٹکی ہوئی ہے۔ یہ سہیلی ایک سارجنٹ کے دام الفت میں گرفتار ہے۔ جس کی اپنی بیوی ایک بوڑھے سیٹھ کے پاس رہتی ہے جس کی پرانی چہیتی رو بیوی منیجر سے الجھی ہوئی ہے، جو اینگلو انڈین لڑکیوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے، جو ملٹری کے نو عمر۔۔۔۔ انہیں چھوڑیئے بھی کیا فائدہ دخل در معقولات سے۔ میرے بال نائی کے پاس، نائی کا استرہ میرے پاس۔ میرا استرہ گھسیارے کے پاس۔ اس طرح یہ زنجیر ایک حلقہ کے منہ میں دوسرے کی دم لئے دنیا کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔ میری بھابی بھی اس زنجیر کا ایک حلقہ ہے اور وہاں جب تک لٹکی رہے گی، جب تک زنجیر کرۂ ارض کو جکڑے رہے گی۔

اور میری تیسری بھابی تو جگ کی دلہن ہے وہ اس سڑک کی مانند ہے جس پر سب چلتے ہیں، اس چھاؤں کی طرح ہے جو ہر تھکے ماندے کو اپنی آغوش میں تھپکیاں دے کر خود فراموشی کے اسباب مہیا کرتی ہے۔ وہ ساجھے کی ہانڈی ہے جو آخر میں چوراہے پر پھوٹے گی، وہ جنھیں منہ کا مزا بدلنے کے لئے نعمت خانہ میں مال مصالحہ رکھنے کی توفیق نہیں وہ اس صلائے عام سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وہ روز شام کو نئے دولہا کی دلہن بنتی ہے اور صبح کو بیوہ ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی ان بہنوں سے کم خوش نصیب ہے جو اللہ کی دین سے ایک شب میں دس بارہ بار دلہن بنتی ہیں۔ دس براتیں چڑھتی ہیں اور دس بار رانڈ ہوتی ہیں۔ بعض لوگ ناک چڑھی پڑوسنوں کی طرح اس پر ٹیڑھی ٹیڑھی نظریں ڈالتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ وہ کچھ نیچ ہے، کوئی گناہ کر رہی ہے،

مگر خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا وہ کون سا پاپ کر رہی ہے دنیا میں کیا نہیں بکتا، اور کیا نہیں خریدا جاتا۔ جو لوگ اسے جسم بیچتا دیکھ کر اتنا بلبلا اٹھتے ہیں، کیا لوگ پیسے کے عوض اپنے دماغ نہیں بیچتے، اپنے تخیلات کا سودا نہیں کرتے، اپنا ضمیر نہیں بیچتے۔ مزدوروں کا خون بھی تو آٹے میں گندھ کر بکتا ہے، کاریگر کا گاڑھا پسینہ بھی تو کپڑے کے تھان رنگ کر فروخت کیا جاتا ہے۔ ایک کلرک کی پوری زندگی چالیس روپیہ مہینہ پر بک جاتی ہے، ایک ٹیچر کی پوری عمر کا سودا اتنے ہی داموں پر ہو جاتا ہے، تو پھر اس جسم خاکی کے لئے کیوں اتنی لے دے۔

اور اس کا باپ کالے بازار کا معزز ستون تھا، اس کا بھائی ناجائز ذرائع سے ناجائز لوگوں تک پہونچاتا تھا، اس کا دوسرا بھائی پولس کا ذمہ دار فرد ہوتے ہوئے بھی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کیا کرتا تھا۔ اور دنیا ان سب کو جانتے ہوئے بھی انھیں گلے سے لگائے بیٹھی ہے، وہ بھی تو آخر انھیں میں سے ایک ہے۔ جہاں آوے کا آوا ہی ٹیڑھا ہے۔ وہاں اس کی بھی کھپت ہونی چاہئے،

ویسے وہ کوئی پشتہا پشت کی رنڈی نہیں۔ اس میں اس کا کیا قصور، وہ آرٹ کی خدمت کرنے فلم لائن میں گئی اور وہاں سے لوگ نہ جانے کب اور کیسے اسے دھیرے دھیرے اس کوٹھے میں کھینچ لائے۔ اس نے یہی تو کیا کہ فلم اسٹار بننے کی خاطر ہر آستانے پر سر ٹیکا، فنانشر سے لے کر ایکسٹرا تک کے گھر کی خاک چھانتے چھانتے وہ خود چھلنی بن گئی، اس گڑبڑ میں وہ نہ جانے کون سا ریہرسل غلط کر گئی جو بجائے آسمان فلم کا درخشاں ستارہ بننے کے وہ یہاں سڑک کے کنارے ٹمٹمانے لگی۔

یہ نہیں کہ اس نے شادی نہ کی ہو، اس نے اس کوچے کی بھی دشت پیمائی کر کے دیکھ لی، مگر شادی کے چند ہی مہینے بعد اس کا میاں حسب معمول ادھر ادھر جانے لگا۔ وہ شاید تنگی، ترشی میں بھی گذر کر لیتی۔ مگر وہ تو جتنے پیر سکوڑتی گئی، اتنی ہی وہ چادر گھٹتا گیا۔

سوائے بیوی بننے کے اسے اور کوئی ہنر نہ آتا تھا، وہ چاہتی تو تیس پینتیس کی استانی گیری کر لیتی مگر اتنے روپے سے تو اسے شمیو کا خرچ چلانے کی بھی عادت نہ تھی، یا ہسپتال میں نرس بننے کی کوشش کرتی، اور ساٹھ روپے کے عوض ۔خون، پیپ، کھانسی بخار، قے دست میں قلابازیاں کھاتی، لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس قسم کی حماقتوں میں جان کھپانے کا شوق اس کے خمیر میں حلول نہیں مجبوراً اسے فلم کے دروازے پر دستک دینی پڑی۔

رنگین فلم ہندستان میں بنتے تو شائد اس کا میدا شہاب رنگ کچھ برق پاشیاں کر سکتا۔ لیکن ان کالے سفید فلموں میں اس کی چوڑی چپکی ناک اور چندھی آنکھوں نے اس کی لٹیا ڈبودی۔ دو چار تھکی ہاری فلمیں ہاکر وہ فنانسر کی آغوش سے گر کر ڈائرکٹر کے پاس آئی۔ وہاں سے پھسلی تو ہیرو، اور سائڈ ہیرو کے ہتھے چڑھی، اس کے بعد ایک کیمرہ مین نے لپکا۔ وہاں سے جو ٹپکی تو قعر گمنامی میں کھسک گئی اور جب آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اس بازار حسن میں معلق پایا۔ مگر وہ اب بڑی سمجھدار ہو گئی ہے، اپنے گاہکوں کو بڑی ہوشیاری سے ناپتی تولتی ہے۔ اگر کسی دن کوئی موٹی مرغی، بدصورت بیوی، اور غلیظ بچوں کی ہنکائی ہاتھ آگئی تو وہ اسے اپنا مستقل گاہک جاڈالے گی، اور سرکار سے اس استقلال کا سارٹیفکٹ حاصل کرکے کالے بازار کے آئندہ ستون تعمیر کرنا شروع کر دے گی۔

یہ ہیں آدم اور حوا کے جانشین۔ تخلیق کے علم بردار اور دنیا کی گاڑی کو چلانے والے جو بجائے چلانے کے اسے لات گھونسے سے آگے پیچھے ڈھکیل رہے ہیں۔

مگر ٹھہرئے میری ایک اور بھابی ہے، پر وہ نہ جانے کہاں ہے، میں نے ایک آدھ بار صرف اس کی جھلک دیکھی ہے۔ کبھی اس کے ماتھے پر ڈھلکے ہوئے زرتار آنچل کو دیکھا ہے، مگر اسے پرچم بنتے نہیں دیکھا۔ ان کی دو دوہ ایسی پیشانی پر محنت کی افشاں چنی دیکھی ہے مگر اس افشاں میں اودے پیلے نیلے سب رنگ ہیں اور سہاگ کی سرخی کی جھلک نظر نہیں آتی، میں نے اس کی حسین انگلیاں تو دیکھی ہیں، مگر انھیں الجھے بالوں کے پیچ و خم سلجھاتے نہیں دیکھا۔ اس کی سانولی شام کو شرمانے والی زلفوں کی گھٹائیں دیکھی ہیں مگر انھیں کسی کے تھکے ہوئے شانوں پر پریشان ہوتے نہیں دیکھا۔ میں نے اس کا چکنا میدے کی لوئی جیسا پیٹ تو دیکھا ہے مگر اس میں ابھی نئی امید کے پودے کو پروان چڑھتے نہیں دیکھا۔ میں نے اس کی چوتیں دیکھی ہیں مگر انھیں شمشیر بنتے نہیں دیکھا۔

سنتے ہیں شہرے دیسوں میں وہ آن بسی ہے، اور ماتھے کی افشاں امر سہاگ کا سیندور بن چکی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی ہمکتی زلفیں چوڑے چکلے شانوں پر بکھر رہی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں الجھے بال ہی نہیں سلجھا رہی ہیں بلکہ بندوقوں میں کارتوس بھر رہی ہیں اور تلواروں کی دھار پر اپنی تیکھی چتونوں سے سان رکھ رہی ہیں۔

دور جانے کی ضرورت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ یہیں بہت قریب میرے پڑوس میں تلنگانہ کی البیلیاں، جی دار جوانوں کی آرتیاں اتار رہی ہیں۔ اور ان کے ہتھیاروں پر عقیدت کے پھول چڑھا کر سیندور کے ٹیکے لگا رہی ہیں۔

میرا ارادہ ہے کہ ایک دن میں بھی اس سرزمین پر جاؤں گی، اور ان سہاگنوں کے ماتھے کا تھوڑا سا سیندور مانگ لاؤں گی، ۔ ۔ ۔ اور اسے اپنی مانگ میں رچاؤں گی۔

اور پھر وہ میری جیتی بھابی میرے دیس کے کونے کونے میں آن بسے گی۔ اگر ان ساس نندوں کے ڈر سے میری بھابی بن کر نہ آسکی تو میں دعوے سے کہتی ہوں، کہ وہ میری بہو بن کر تو ضرور آئے گی۔

احمد عباس

شاعر کی آواز

آپ نے راجوں، مہاراجوں، شہزادوں، شہزادیوں، جنوں، بھوتوں اور پریوں کی کہانیاں تو ضرور پڑھی اور سنی ہوں گی، مگر شاعر کی کہانی نہ سنی ہوگی، آئیے آج آپ کو شاعر کی کہانی سناؤں، گو راجا اس میں بھی آتا ہے۔

ایک تھا شاعر، ارتقا کے چابکدست ہاتھوں نے اسے نہایت نرم و نازک مٹی سے بنایا تھا، اس کی فطرت میں آبشاروں کی موسیقی تھی اور شہد کی مٹھاس، شفق کی رنگینی تھی، اور پھولوں کی خوشبو، بادلوں کی نرمی تھی، اور ہرے بھرے کھیتوں کی شادابی۔ اس کا دل سوز اور ساز سے بھرا تھا، انسان کے دکھ اور سکھ دونوں سے وہ آشنا تھا۔ اس کے تخیل کی پہنچ آسمان سے اونچی تھی، کائنات کا کوئی پہلو اس کی نظر سے اوجھل نہ تھا۔ وہ زمین کا محرم تھا مگر فلک کے بھید بھی اس سے چھپے نہیں تھے۔

وہ فطرتاً آزاد تھا، مکان اور وقت سے آزاد، نسل اور مذہب، قوم اور ذات کے بندھنوں سے آزاد، فکر معاش اور غم روزگار سے آزاد، وہ آزاد منش، بے فکر اور لاپرواہ تھا۔ جہاں جی چاہے گھومتا۔ کہیں بھی ٹھہر جاتا، جب دل چاہتا پھر چل کھڑا ہوتا ہے۔ آج یہاں کل وہاں، زندگی کا کارواں جدھر مڑتا وہ بھی ادھر کا رخ کرتا۔ کبھی راہرو تو کبھی راہ گر۔ آج قافلے کی گرد کا سراغ لگا رہا ہے تو کل قافلہ سالاری کر رہا ہے۔ کبھی زندگی کو "بازیچۂ اطفال" سمجھ کر اس پر ہنس رہا ہے: در ہنسا رہا ہے، کبھی "بند حیات و بند غم" کو ایک ہی بتا کر رو رہا ہے، اور رلا رہا ہے، کبھی "سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا سفیر" بھیج رہا ہے، تو کبھی خدا کو للکار رہا ہے۔ کبھی "رات کے تاروں میں اپنا رازداں" تلاش کر رہا ہے، تو کبھی زمین و آسمان دونوں کو پھونک کر اپنی "خودی" سے اپنا جہاں آپ پیدا کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ شاعر تھا۔

ساری دنیا شاعر کو پسند کرتی تھی، اس کے گیت سن کر سر دھنتی تھی، گو اس کی بے فکری کی زندگی اور عاشقانہ اشعار کی وجہ سے، بڑے بوڑھے اس کے چال چلن کو مشتبہ سمجھتے تھے، کبھی وہ باغ میں نکل جاتا تو پھولوں پر بلبل کو فریفتہ دیکھ کر غزل کہہ دیتا۔ کبھی پنگھٹ پر کوئی دیہاتی حسینہ دکھائی دے جاتی اس کے گیت گانے لگتا، کبھی رات کے وقت الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے گاؤں کے بوڑھوں کی زبانی کسی پرانے زمانے کے عاشق و معشوق کے جوڑے کا ذکر سن لیتا تو مثنوی موزوں ہو جاتی۔

ہاں تو شاعر کو ساری دنیا پسند کرتی تھی، مگر راجا اس سے جلتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاعر راجہ کا ادب نہیں کرتا تھا۔ ساری ریاست میں شاعر ہی اکیلا تھا جس کا سر راجہ کے سامنے کبھی نہ جھکا تھا۔ جب کبھی راجہ کی سواری نکلتی تو اس کی بھوکی ننگی رعایا سڑک کے دونوں طرف قطاریں باندھ کر جے جے کار سے اس کا سواگت کرتی۔ (یہ اور بات ہے کہ ہر ایک کے پیچھے ایک سپاہی تلوار یا سنگین لئے کھڑا رہتا تھا، کہ اگر وقت پر راجہ کے حضور میں سر نہ جھکے تو ایک کچوکا دے کر آگاہ کر دیا جائے) ہاں تو ان کے جھکے ہوئے سروں میں راجہ کو شاعر کا سر کبھی نہ نظر آتا اور اس کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا۔ شاعر اپنے آپ کو خود اقلیم سخن کا شہنشاہ سمجھتا تھا۔ بھلا اسے کیا پڑی تھی کہ ایک معمولی راجہ کے حضور میں حاضر ہو۔

ایک دن کی بات ہے کہ شاعر مشق سخن کی دھن میں باغ میں جا نکلا کہ گل و بلبل کے عشق کو کسی نئی غزل کا موضوع بنائے مگر وہاں کوئی پھول ہی نہیں تھا۔ گلاب کی سب جھاڑیاں زمین میں ملی، روندی ہوئی پڑی تھیں۔ معلوم ہوا کہ راجہ کی گھوڑ سوار فوج ادھر سے گذر گئی ہے اور ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے سارے چمن کو برباد کر ڈالا ہے۔ یہ دیکھ کر شاعر کا نازک اور حساس دل بھر آیا۔ اس نے سوچا نہ جانے یہ سماں دیکھ کر بلبل

پر کیا گذری ہوگی، لگن کے فراق میں بیچاری نالہ و بکا کر رہی ہوگی۔ مگر چاروں طرف سناٹا تھا۔ بلبل کی آواز نہ سنائی دی۔ پھر اس نے دیکھا کہ سلی ہوئی پنکھڑیوں کے پاس ہی بلبل ایک زہریلے تیر سے چھدی ہوئی مردہ پڑی ہے۔ راجہ نے شکار پر جاتے ہوئے تیر اندازی کی مشق کرنے کے لئے اسی غریب کو نشانہ بنا دیا تھا۔

چمن سے مایوس ہو کر شاعر نے سوچا چلو پنگھٹ پر چلیں اور وہاں اپنی رادھا اور اس کی سندر سکھیوں کی چہل دیکھ کر کوئی گیت لکھیں مگر آج پنگھٹ پر بھی وہ پہلی سی رونق نہ تھی۔ اب لڑکیاں خاموشی سے پانی بھر رہی تھیں۔ ان کے گالوں میں گڈھے پڑے ہوئے تھے، سڈول باہوں پر گوشت غائب ہو کر ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے، بال مٹی میں اٹے ہوئے تھے اور کپڑے تار تار تھے، ان کے ہونٹوں پر سے ہنسی تو کیا مسکراہٹ بھی غائب تھی، حیران ہو کر اس نے پوچھا۔ تم سب کو کیا ہوا۔ تب انھوں نے بتایا کہ گاؤں میں کال پڑا ہے اور کتنے ہی دن سے وہ سب پانی پی پی کر ہی گذارہ کر رہے ہیں "میری رادھا کہاں ہے"؟ اس نے پوچھا اور ان میں سے کوئی بولی "وہ دیکھو سڑک پر ـــــ"

یہ سڑک راجہ کے موٹر کے لئے بنائی جا رہی تھی، اور کال کے مارے بہت سے کسان اس پر کام کر رہے تھے، راجہ کے آدمی ہاتھوں میں کوڑے لئے ادھر ادھر پھر رہے تھے، کہ اگر کوئی لمحے بھر کے لئے بھی کام سے کوتاہی کرے تو اس کی خبر لیں۔ شاعر ادھر ادھر دیکھا، رادھا کو تلاش کر تا جا رہا تھا، کہ اسے کانچ کی چوڑیاں کھنکنے کی آواز آئی۔ وہ پہچان گیا کہ یہ اس کی رادھا کی چوڑیوں کی مدھر کھنکھناہٹ ہے، مڑ کر دیکھا تو رادھا ایک بھاری موگری ہاتھ میں لئے سڑک کوٹ رہی تھی، بھوک اور محنت سے اس کی ساری سندرتا جاتی رہی ہے، نہ آنکھوں میں پہلی سی چمک تھی اور نہ سینے میں ابھار، جن زلفوں کو وہ ناگنوں سے تشبیہ دیا کرتا تھا۔ وہ آج مٹی اور کیچڑ میں اٹی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں کی مہندی اڑ چکی تھی اور اس کے بجائے ہتھیلیوں سے خون پھوٹ آیا تھا ننگے پاؤں میں آبلے پڑے ہوئے تھے، وہ تو اس کو پہچان بھی نہ پاتا تھا۔ اگر اس کے ہاتھوں میں وہی کانچ کی آسمانی چوڑیاں نہ ہوتیں جو پچھلے تہوار پر خود اس نے لا کر دی تھیں، وہ سر جھکائے سڑک کوٹ رہی تھی، ہر دھماکے کے ساتھ چوڑیاں کھنک رہی تھیں، اور فضا میں ایک عجیب اور دردناک موسیقی پھیلی ہوئی تھی، اور پھر ایک بار جب اس نے موگری کو سڑک پر زور سے مارا، اس کی کلائی لکڑی سے ٹکرائی، اور کئی چوڑیاں ٹوٹ کر زمین پر گریں مگر رادھا کو ان کا کوئی ہوش نہ تھا۔ وہ سڑک کوٹتی رہی۔ پتھر اور مٹی کے ساتھ ہی آسمانی چوڑیوں کو بھی سڑک میں دفن کرتی رہی . . . چوڑیاں . . . آسمانی چوڑیاں ـــ جو شاعر نے اسے لا کر دی تھیں۔

شاعر نے سوچا دیہاتی اپنے سرسبز و شاداب کھیتوں کو چھوڑ کر کیوں یہاں سڑک کوٹنے آگئے۔ رادھا نے چاندی کے چند ٹکڑوں کے لئے اپنی جوانی، اپنی سندرتا، اپنی عزت کو کیوں بیچ دیا۔ سچا آنند صرف آکاش کے تلے ان ہرے بھرے کھیتوں میں مل سکتا ہے . . . سو وہ کھیتوں میں گیا۔ لہلہاتے ہوئے کھیت، جہاں تک نظر جائے ہریالی ہی ہریالی ـــــ گیہوں کی بالیں سورج کی روشنی میں جھوم جھوم کر ہنس رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر شاعر کا مرجھایا ہوا دل ایک بار پھر خوشی اور امید سے شگفتہ ہو گیا، اس نے سوچا میں رادھا کو جا کر لے آتا ہوں، اس کی نازک کلائیاں سڑک کوٹنے کے لئے نہیں بنائی گئیں۔ ان میں "تو کنگن جگمگانا چاہئے"، میں کھیتوں میں ہل چلاؤں گا، بیج بوؤں گا۔ فصل پیدا کروں گا۔ دوپہر کو میری رادھا سر پر ٹوکری دھرے، میرے گیت گاتی ہوئی میرا کھانا لے کر آیا کرے گی۔ کتنا سکھ، کتنا آنند ہو گا۔ یہی کھیت سورگ بن جائیں گے، پر اسی وقت اس نے دیکھا کہ ساہوکار کے آدمی آئے اور انھوں نے ان تمام کھیتوں اور فصل کی قرقی کرالی۔ کسانوں کی بیدخلی کر دی گئی، کھیت ساہوکار کے ہو گئے اور شاعر کو ساہوکار نے یہ کہہ کر دھتکار دیا کہ "کیوں بے کیا بھٹے چرانے آیا ہے"؟

ابھی تک شاعر نہ غزل کہہ پایا تھا، نہ گیت نہ نظم۔ لکھے تو کیا لکھے۔ اس کے تخیل پر چوٹ پر چوٹ پڑ رہی تھی، اس کے پھول سلے ہوئے پڑے تھے، اس کی بلبل کا سینہ چھدا ہوا تھا۔ اس کی رادھا کی چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ دنیا میں نہ کہیں حسن نظر آتا تھا نہ عشق۔ نہ

نظم کس پر لکھے۔ پھر اس نے سوچا نظارۂ قدرت انسان کی کرتوتوں سے بے نیاز ہے ان سب جھگڑوں سے دور . . . . بہت دور . . . . . . میں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاؤں گا . . . . . . اور وہاں سے سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھوں گا جب مغربی آسمان پر شفق کی رنگا رنگی ہوگی، اور ہوا میں خنکی اور خوشبو، صناعِ فطرت کے اس شاہکار پر میں نظم لکھوں گا۔

سو وہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ آسمان پر واقعی شفق پھیلی ہوئی تھی، سرخ اور زرد اور سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اس رنگین منظر کو دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔ اس کے کانوں میں ایک گیت کی مدھر تان گونجنے لگی، مگر . . . ہوا میں خنکی کیوں نہیں؟ اور فضا میں سارے جہان کے پھولوں کی خوشبو کے بجائے دھوئیں اور جلی ہوئی ہڈیوں کی بو کیسی . . . . . . جیسی شمشان بھومی کی جلتی ہوئی چتاؤں میں سے آتی ہے؟ . . . . . . پھر اس نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ افق پر غروب آفتاب کی شفق سے رنگا رنگی نہیں تھی، بلکہ راجہ کے سپاہیوں نے مزدوروں کی ایک بستی میں آگ لگا دی تھی اور اس کے لال اور پیلے شعلوں اور کالے دھوئیں کے بادل تھے۔ جو آسمان پر چھائے ہوئے تھے راجہ کی موٹر ادھر سے گذری تھی، اور ان اندھیرے، ننگے، سڑے، بدبودار جھونپڑیوں کو دیکھ کر راجہ کی نازک طبیعت کو بڑی ٹھیس لگی تھی اور اس نے حکم دے دیا تھا، کہ اس ساری بستی کو رات ہونے سے پہلے جلا کر خاک کر دیا جائے تاکہ آئندہ سیر و تفریح کے وقت ایسا بدہیبت نظارہ اس کے مزاج کی ناگواری کا باعث نہ ہو۔ بستی جلا دی گئی تھی، اور جھونپڑوں میں کئی مزدور اور ان کی عورتیں اور بچے بھی جل مرے تھے اور یہ ان ہی کے ہڈیوں کے جلنے کی بو تھی جو شعلوں سے جھلسی ہوئی گرم ہوا فضا میں پھیلا رہی تھی،

شاعر جانتا تھا کہ ان شعلوں اور دھوئیں کے بادلوں کے پیچھے آسمان پر ضرور رنگین شفق پھیلی ہوئی ہوگی، مگر وہ اس وقت تک اس کی نظر سے اوجھل رہے گی۔ جب تک ظلم کی آگ کا یہ دھواں چھایا ہوا ہے۔

مزدوروں کی جلتی ہوئی بستی پر پھر نظر کی تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ یہ انقلاب کی آگ ہے۔ جس کی لپٹیں ایک دن ساری دنیا کو جھلس ڈالیں گی۔ اور اسی وقت اس کے دماغ سے خود اعتمادی کی ایک لہر دل میں ہوتی ہوئی اس کی زبان تک آئی۔ اور گویا دنیا کو للکار کر وہ پکار اٹھا۔

نصیبِ خفتہ کے شانے جھنجھوڑ سکتا ہوں طلسمِ غفلتِ انساں کو توڑ سکتا ہوں

اور پھر للکارا

پکڑ کر ہاتھ مسند سے اٹھا دیتا ہوں سلطاں کو بٹھا دیتا ہوں لا کر تختِ پرویز کے دہقاں کو

مزدوروں کے جھونپڑے جل رہے تھے اور شاعر کے تخیل میں وہ شعلے ایک آتشیں ہیولہ بن کر ناچ رہے تھے، آگ اور خون، خون اور آگ، دھوئیں کے بادل، لپکتے ہوئے شعلے، یہ سب دیکھ کر شاعر پکار اٹھا۔

آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے
خون کی بو سے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی
کوہساروں کی طرف سے سرخ آندھی آئے گی
جابجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی (مجاز)

اور اس آگ میں، ان شعلوں میں، اس تخریب میں اسے ایک نئی دنیا، ایک بہتر دنیا کی جھلک دکھائی دے وہ

بول اٹھا . . . . . .

شہر یہ دل شاد ہو گا۔ ایک دن
یہ کھنڈر آباد ہو گا ایک دن
پھر نسیم جانفزا اٹھلائے گی
لالۂ و گل پھر بہار آ جائے گی
ریگ ساحل پر نیاں ہو جائے گی
یہ زمیں پھر آسماں ہو جائے گی (سردار جعفری)

شاعر کی آواز میں کوئی جادو تھا، یا یہ شاید اس کی آواز نہ تھی بلکہ اس کی ساری قوم کی آواز تھی، انسانیت کی آواز تھی، کیونکہ اس کے گیتوں کی گونج سارے سارے دیش میں پھیل گئی، اسے سن کر جو سو رہے تھے وہ جاگ اٹھے جو تھک کر بیٹھ رہے تھے وہ پھر منزل کی طرف چل کھڑے ہوئے جو مایوس ہو چکے تھے، ان کی آنکھیں پھر امید سے چمک اٹھیں۔ شاعر نے دیکھا کہ انسانوں کا ایک امڈتا ہوا سیلاب اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

کسان

مزدور

کاریگر

فقیر

بھکاری

مظلوم

سڑک کوٹنے والی عورتیں۔ اور ان میں اس کی رادھا بھی۔

مگر وہ خواب صرف رادھا کا شاعر نہیں تھا، آج وہ ساری قوم کا شاعر تھا۔ ایک نئی دنیا کا پیغامبر۔ ان مزدوروں کسانوں، مجبوروں، اور مظلوموں کی طرف دیکھ کر اس نے وعدہ کیا۔

آج سے میں اپنے گیتوں میں آتش پارے بھر دوں گا
مدھم لچکیلی تانوں میں جیوٹ دھارے بھر دوں گا
جیون کے اندھیارے پگ پر مشعل لے کر نکلوں گا
دھرتی کے پھیلے آنچل میں سرخ ستارے بھر دوں گا
اب سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا (ساحر)

رادھا کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو کر اب اس کے ہونٹوں پر امید اور خوشی کی مسکراہٹ تھی، اس کی ساڑھی ابھی پھٹی ہوئی تھی۔ اور آنچل جو سر پہ پڑا تھا تار تار تھا۔ پھر بھی اس پھٹے آنچل میں اس کا چہرہ ماہتاب کی طرح چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر

شاعر کو بہت سے سنہرے سپنے یاد آ گئے، سینکڑوں، ارمانوں اور مسرتوں نے اس کے دل میں کروٹ لی۔ مگر اس نے رادھا کی طرف دیکھ کر کہا:۔

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا۔ (مجاز)

رادھا کے سر سے آنچل نیچے آ گیا۔ اور وہ مزدوروں اور کسانوں کی اس فوج میں مل گئی، جو نعرے لگاتی، شاعر کے گیت گاتی جا رہی تھی، آندھی کا ایک تند جھونکا آیا اور رادھا کا آنچل پرچم بن کر لہرانے لگا۔

شاعر بھی اس انقلابی فوج کے ساتھ چل رہا تھا۔ اور ڈنکے کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر گا رہا تھا۔

ڈنکے کی چوٹ سے آسماں گونج رہا ہے
ہمارے پاؤں تلے کی زمین ناہموار ہے
لیکن نئی صبح کے فرزندو!
بڑھے چلو بڑھے چلو
ہم شفق کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے
اور صبح کی دولہن کو باہر لائیں گے
ہم رات کی ظلمت کو چیرتے جائیں گے
خواہ راستے میں بندھیاچل جیسے پہاڑ کیوں نہ حائل ہوں

(نذر الاسلام)

عوام کے باغیانہ نعروں نے راجہ کے محل کی دیواروں کو ہلا دیا۔ وہ اپنے درباریوں پر برس پڑا، گرج کر بولا:۔

"اس بغاوت کا ذمہ دار کون ہے؟"

انھوں نے کہا۔ "شاعر"

راجہ چلایا۔ "شاعر کو خرید لو"

درباری بھاگے بھاگے شاعر کے پاس پہنچے اور کہا۔ "راجہ تمہیں دنیا کی ہر دولت، ہر عیش و آرام دینے کے لئے تیار ہے۔ اس بغاوت کی آگ بجھا دو تو وہ تمہارا منہ ہیرے جواہرات سے بھر دے گا"

شاعر نے جیب سے چنے اور مونگ پھلیاں نکال کر ایک پھنکی لگاتے ہوئے جواب دیا "میں انسان ہوں چنے کھاتا ہوں تمہارے راجہ کی طرح شتر مرغ نہیں ہوں جو کنکر پتھر کھاؤں۔

راجہ نے جب یہ سنا تو غصہ سے چلایا۔ "شاعر کو قید کر دو"

سو شاعر کو ایک کال کوٹھری میں ڈال دیا گیا۔ بیس برس قید بامشقت کی سزا دی گئی، باغیانہ نظمیں لکھنے کے جرم میں اور قید خانے سے شاعر نے اپنی رادھا کو مخاطب کر کے ایک نظم لکھی۔

بیس سال قید

کاغذ کے ایک پرزے پر لکھے ہوئے چند الفاظ کی بنا پر
لیکن میری رفیقہ!
اس میں غمگین ہونے کی کوئی بات نہیں
یہ ان کی بزدلی اور خوف ہے ... ...

اپنے دل سے مایوسی دور کرو
ہنسو کہ یہ ہماری فتح ہے
اگلے برس یا اس سے اگلے برس یا اس سے اگلے کون جانتا ہے؟
ہم یہاں بیٹھے مستقبل کا خواب دیکھیں گے
اپنے جھکے ہوئے سر کو بلند کرو
اور سنو
سنو طوفانی لہروں کی آواز
جیسے ایک خاموش سمندر میں ابال آگیا ہو۔
بہت جلد یہ لہریں دنیا کے آہنی دروازوں پر دستک دینے والی ہیں

(دیانگ سو)

شاعر کی آواز قید خانے کی دیواروں سے ٹکرا کر فضا میں پھیلتی رہی۔ اور انقلابی فوجیں اس کے گیت گاتی ہوئی راجہ کے محل کے پاس آن پہنچیں۔ ان کے استقبال کے لئے شاعر کی آواز قید خانے کی دیواروں کو پار کرتی ہوئی آئی۔

رک نہ سکتا تھا انقلاب زمیں
کر گیا کام سوز ناکامی
دل کی بے تابیوں سے محو کلام
دے اٹھی لو خود آرزوئے حیات
کرب و امید کے منازل ہیں
قافلہ ولولوں کا آج اے دوست
سوئے آزادیٔ وطن ہے رواں
قلب سے گرچہ اٹھ رہا ہے دھواں
ایک ستارہ افق پہ چمکے گا
ملک خواب گراں سے اٹھے گا

منزلیں ہوں گی خود غبار بہت
سرنگوں ہوں گے تاجدار بہت
ان کے ٹوٹے ہوئے سنگینوں پہ

سرفروشوں کا نام چمکے گا (پشکن)

راجہ گھبرا گیا۔ اس نے شاعر کو بلا کر کہا۔ ابھی باغی فوجوں کو پیچھے ہٹ جانے کو کہو ورنہ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ شاعر نے مسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا جہاں کالے کالے بادل ابھی سے راجہ کا سوگ منا رہے تھے، اور بجلی کی چمک اور کڑک شہنشاہیت کی موت کا پیغام سنا رہی تھی، وہ بولا، "میں مرنے کے لئے تیار ہوں" اور پھر . . .

سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی
صدا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے (جوشؔ)

اب تو راجہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے کہا "شاعر کی زبان گدّی سے کھینچ لو۔"

جلاّد نے چھرا نکالا، اور شاعر کی زبان کاٹ ڈالی گئی۔ مگر شاعر کے چہرے سے وہ فاتحانہ مسکراہٹ دور نہ ہوئی: "یہ زبان سے نہیں میرے دل سے پیدا ہو رہے۔ زبان کاٹنے سے میری آواز بند نہ ہوگی" اور واقعی شاعر کی آواز اور بھی زور سے گونج اٹھی کیونکہ یہ اسی کی آواز تھوڑا ہی تھی، یہ تو لاکھوں، کروڑوں کی آواز تھی، اور دنیا نے شاعر کا پیغام سنا ـــــ

میں دیکھ رہا ہوں جو کسی کو دکھائی نہیں دے رہا۔
وقت کی چوٹیوں کے اوپر سے آتے ہوئے
کانٹوں والے تاج کو پہنے
میں انقلاب کو ابھرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں
سنو!
آئندہ نسلوں میں آنے والے ساتھیو!
سنو ایک شاعر کی آواز
یہ اشعار جو بیس برس تک فاتحانہ شان سے چھائے رہے
اوّل سے آخر تک تمہاری نذر کرتا ہوں (مائیکافسکی)

انقلابی فوجیں اب راجہ کے محل کے پھاٹک تک پہنچ چکی تھیں۔ راجہ کو اپنی موت سامنے کھڑی نظر آئی۔ اس کے غصے میں اب خوف کا پہلو زیادہ نمایاں تھا۔ کانپتی ہوئی آواز میں پاگلوں کی طرح چلایا۔

"یہ شاعر نہیں جادوگر ہے۔ اس کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دو۔"

جلادوں نے ایسا ہی کیا۔ شاعر کے ٹکڑے اڑا دئے گئے۔ مگر راجہ کی یہ سب سے بڑی بھول تھی، کیونکہ جہاں کہیں بھی شاعر کے بدن کا ایک ٹکڑا بھی گرا اس زمین سے ایک اور شاعر پیدا ہوا جس کی آواز اور بھی زور سے گونجی۔ اور جہاں کہیں اس کے خون کا ایک قطرہ بھی گرا وہاں سے انقلاب کا ایک سپاہی پیدا ہوا۔ اس طرح راجہ کا راج ختم ہو گیا۔ اور کہانی بھی ختم ہو گئی۔ مگر شاعر کی آواز بند نہ ہوئی۔ اور آج بھی گونج رہی ہے . . .

"جہاں کہیں درد ہے وہاں میں ہوں۔
ہر آنسو پر جو بہایا جاتا ہے
میں اپنے آپ کو مصلوب محسوس کرتا ہوں (مایکانسکی)

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اس شاعر کا نام کیا تھا۔ ممکن ہے اس کا نام سقراط ہو، جسے پرانے یونان کی "سی۔ آئی ڈی" نے نوجوانوں کے اخلاق بگاڑنے کے جرم میں گرفتار کر کے زہر کا پیالہ پلایا تھا۔ ممکن ہے اس کا نام سرمد ہو جسے باغیانہ اور صوفیانہ خیالات پھیلانے کے جرم میں اورنگ زیب نے قتل کرایا۔ ممکن ہے اس کا نام والٹ وہٹ مین ہو جسے امریکن پولس نے اپنی نظموں کا مجموعہ پاس رکھنے کے جرم میں قید کیا۔ ممکن ہے اس کا نام بھگت سنگھ ہو جو خود شعر نہ کہنے پر بھی شاعر تھا اور "میرا رنگ بسنتی چولا" گاتے ہوئے پھانسی پر چڑھ گیا۔ ممکن ہے اس کا نام ٹیگور ہو جس کے گیتوں کو انگریزوں نے باغیانہ قرار دیا۔ اور آج بھی جس کے گیت گانے کے لئے پولس سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ ممکن ہے اس کا نام یانگ سو ہو، جسے چیانگ کائی شک نے بیس برس قید میں رکھا ممکن ہے اس کا نام مخدوم محی الدین ہو۔ جس کے گیتوں نے تلنگانہ میں انقلاب برپا کر دیا۔ ممکن ہے اس کا نام ساحر لدھیانوی ہو جس کے سویرا کو پاکستان حکومت نے بند کر دیا مگر جو آج پھر اسی انقلابی "شاہراہ" پر گامزن ہے اور ممکن ہے اس کا نام علی سردار جعفری ہو جسے ۲۱ رجنوری کو صبح کے سات بجے بمبئی پولس کی مسلم برانچ نے گرفتار کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسہ میں پڑھا گیا)

وشوامتر عادل

(سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی)

تشدد کا جواب

۶ر فروری ۱۹۴۹ء کو انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی نے حسب ذیل تجویز اتفاق رائے سے منظور کی

"ہم سردار جعفری کو ایک بار پھر اپنی صفوں میں پاکر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ہماری انجمن کی تحریک نے خواہش خواہ اثر کیا۔ ترقی پسند قوتوں کی یہ بہت بڑی جیت ہے اور رجعت پرستوں کی شکست۔ اس موقع پر ہم ان تمام جماعتوں اور افراد کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جنھوں نے سردار جعفری کی رہائی کی تحریک چلانے میں ہماری انجمن کا ساتھ دیا۔ ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ نیاز حیدر اور کیفی اعظمی کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ان دونوں ادیبوں کے نام وارنٹ واپس لئے جائیں۔"

سوال یہ ہے کہ یہ تماشا کیوں اور کیسے ہوا؟ دسمبر کے مہینے میں بمبئی کے ایک علاقے ماہم میں ایک مشاعرہ ہوا تھا۔ جس کی صدارت سردار جعفری نے کی تھی، جس میں اور بہت سے شعرا کے علاوہ کیفی اعظمی، اور نیاز حیدر نے بھی نظمیں پڑھیں، جعفری نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو ہندی ہندستانی کے مسئلہ پر انجمن کی پالیسی کی وضاحت کی اور آج ہندستان میں جو اردو دشمنی کی وبا پھیل رہی ہے اس کی تنقید کی اور کہا کہ اردو اور ہندی دو الگ الگ زبانیں نہیں ہیں بلکہ بنیادی طور سے ایک زبان کے دو ادبی روپ ہیں، اور ہندستانی کو ایک ترقی یافتہ زبان بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے دونوں ادبی انداز سیکھے جائیں اور ان کو ایک زبان میں سمو دیا جائے، اس لئے آج اگر اردو کا گلا گھونٹا جاتا ہے تو وہ ایک فرقے کی زبان پر نہیں، ایک قوم کی زندہ زبان پر حملہ ہے اور اس حملے کے خلاف اردو اور ہندی کے ترقی پسند مصنفین سینہ سپر ہیں۔ جعفری نے بڑے صاف الفاظ میں یہ کہا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے اور جو ارباب حکومت اور ارباب سیاست اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر ختم کرنا چاہتے ہیں وہ فرقہ پرستی اور تعصب کا شکار ہیں اور وہ اپنے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ مفاد کے لئے یہ نازیبا حرکتیں کر رہے ہیں۔

مشاعرے میں جو نظمیں پڑھی گئیں وہ ملک کی موجودہ فضا کے متعلق تھیں ان میں امن و اتحاد، عوامی انقلاب اور جمہوری آزادی کی بشارت تھی، فرقہ پرستی اور سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ لوٹ کھسوٹ کے خلاف تبلیغ تھی، یہ سب ترقی پسند شاعری کے عام موضوعات ہیں اس شاعری کی مقبولیت کا اصلی راز بھی یہی ہے کہ اس کا ہر ہر لفظ عوامی جذبات کا ترجمان ہوتا ہے۔ ماہم کے مشاعرے میں بھی ان نظموں سے گرمی پیدا ہوگئی اور مجمع کے دل دھڑک اٹھے،

اس واقعے کے ایک مہینے بعد بمبئی سی۔ آئی۔ ڈی۔ کی مسلم برانچ نے ۲۱ر جنوری ۱۹۴۹ء کو سردار جعفری کو گرفتار کر لیا اور نیاز حیدر اور کیفی اعظمی کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دئے۔ ان تینوں شاعروں کے خلاف مسلمانوں میں فرقہ پرستی پھیلانے کا الزام تھا۔ لیکن چونکہ یہ الزام ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے، جعفری کو قانون تحفظ عامہ کے تحت جیل میں بند کر دیا گیا۔ یہ انتہائی غیر جمہوری قانون ہے جس کے تحت کسی بھی شخص کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے نامعلوم مدت کے لئے جیل میں بند کیا جا سکتا ہے۔ ایسا قانون یا تو فاشسٹ ممالک میں تھا، یا "آزاد" ہندستان میں نافذ ہے، ہزاروں آدمی اس کا شکار ہیں۔ جن میں کمیونسٹوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، پاکستان میں نقوش، ادب لطیف اور سویرا پر بھی اسی قانون کے ماتحت چھ مہینے کی پابندی لگائی گئی تھی، رجعت پرستی کی اس دوڑ میں آخر ہندستان کیسے پیچھے رہ سکتا تھا

پاکستان میں تین ترقی پسند رسالے بند کئے گئے تھے، ہندستان میں تین ترقی پسند شاعروں پر ہلہ بول دیا گیا، یہ دوسری بات ہے کہ اس میں رجعت پرست عناصر کو منہ کی کھانی پڑی۔

سردار جعفری کی گرفتاری اور کیفی اعظمی اور نیاز حیدر کے وارنٹ کی خبر سے ہندستان بھر کے ادبی اور تہذیبی حلقوں میں غم اور غصے کی ایک لہر دوڑ گئی، اور ترقی پسند ادیبوں اور فن کاروں نے ایک ساتھ صدائے احتجاج بلند کی۔ اور یہ صدا رجعت پرستی کے ایوانوں سے ٹکرائی۔

گرفتاری کے دوسرے دن بمبئی کے ترقی پسند مصنفین نے اپنے جلسۂ عام میں ایک احتجاجی تجویز منظور کی جو نیا ادب کے سالنامے (ماہ جنوری) میں چھپ چکی ہے،

اسی دن آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے یہ پیغام انجمن ترقی پسند مصنفین کو بھیجا گیا۔

"ساتھیو! ہم نے علی سردار جعفری کی گرفتاری کی خبر غصہ اور نفرت سے سنی"۔

"کامریڈ جعفری ہماری جماعت کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہ چکے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں وہ علی گڑھ یونیورسٹی سے اس لئے نکال دئے گئے تھے کہ انھوں نے لیگی فرقہ پرستوں کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور ہمیشہ طلبا کی جدوجہد میں رہنمائی کرتے رہے۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہیں اور کوئی باہوش انسان کمیونسٹوں پر فرقہ پرستی کا الزام نہیں لگا سکتا۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ممتاز رکن ہیں۔ ان کا قلم عوام کی خدمت اور رجعت پسند طاقتوں سے جنگ کرنے کے لئے وقف ہو چکا ہے، ایسے شخص پر فرقہ پرستی کا الزام لگانا محض جھوٹ اور فریب ہے۔

"مگر ہم طالب علموں کو اس جھوٹ اور فریب پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ ہم کو اپنے ایک سال کے تجربے سے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ موجودہ حکومت عوام کے ہر مفاد سے منہ موڑ چکی ہے — ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح وہ عوام دشمن پالیسی پر عمل کر رہی ہے۔

"تمام ہندوستان میں فیس بڑھا کر کسان، مزدور اور متوسط طبقے کے بچوں کو تعلیم سے محروم کیا جا رہا ہے۔ صوبہ یوپی میں اس سال دس فی صدی کم طالب علم تعلیمی اداروں میں داخل ہوئے ہیں۔ ہزاروں طالب علموں کو صرف ایک وقت کا کھانا بہ مشکل ملتا ہے، ہزاروں مانگی ہوئی کتابوں سے کام چلاتے ہیں۔ یہ سب جانتے ہوئے اور لاکھوں استادوں اور ودیارتھیوں کی شدید مخالفت کے باوجود فیس بڑھائی گئی ہے اور بڑھائی جا رہی ہے۔ جب ہم اپنے سامنے اسکولوں اور کالجوں کے بند ہوتے ہوئے دروازوں کو دیکھتے ہیں تو ہم جان جاتے ہیں کہ یہ حکومت ہمارے مفاد کی دشمن ہے ہم سمجھتے ہیں کہ وہ کس کے مفاد میں کام کر رہی ہے۔

"ہم کو جعفری کی گرفتاری اور جھوٹے الزام پر تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ ہم نے اسی شہر بمبئی میں ٹیگور کے گیتوں پر پابندی لگتے ہوئے دیکھی ہے۔ ہم نے اسی شہر بمبئی میں شکسپیر کے ڈرامے ہیملٹ فلم پر قینچی چلتی دیکھی ہے، ہم نے اسی شہر میں عمر شیخ اور انا بھاؤ ساٹھے کی زبان بندی ہوتے دیکھی ہے۔

"اپنی تعلیم کو اپنے ہاتھوں سے چھنتے دیکھ کر، ٹیگور کا گلا گھٹتے اور شکسپیر کا منہ بند ہوتے دیکھ کر ہم کو احساس ہوا تھا کہ ہماری آزاد سرکار عوامی تعلیم، عوام کی تہذیب، عوامی اور جمہوری ادب اور کلچر کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اسی لئے سردار جعفری کی گرفتاری اور ان پر جھوٹے الزام سے ہم کو حیرت نہیں ہوئی، ہم کو غصہ آیا اور ہم نے صاف طریقہ سے سمجھ لیا کہ آزاد ہندستان کتنا آزاد ہے، "عوام کی حکومت، عوام سے کتنی قریب یا دور ہے۔

"ساتھیو! جو حکومت چند منٹ میں دس برس کے بچوں، ۵۰ برس کے بوڑھوں اور عورتوں کے خون سے کلکتہ کی سڑکوں کو سرخ کر دے جس کی گولیوں نے فنکار، کسان، مزدور، الہ آباد اور بنگال کے کھیتوں، تلنگانہ کی پہاڑیوں، اور مدراس، اور کانپور اور امل نیر کی مزدور بستیوں

میں تڑپتے ہوں۔ وہ حکومت نا گوچی کے دکھائے ہوئے راستہ پر چل رہی ہے ۔۔۔ کیا وہ ٹیگور کی دوست ہوسکتی ہے؟ گوبلز نے کہا تھا جب میں کلچر کا نام سنتا ہوں تو اپنی بندوق نکال لیتا ہوں" ہمارے دیس میں جب طالب علم اور استاد پیٹ بھر روٹی کے لئے جمہوری اور عوامی تعلیم کے لئے سڑکوں پر مظاہرے کرتے ہیں تو ہماری سرکار کی پولیس ان پر گیس، گولی اور لاٹھیاں برساتی ہے؟ کیا ایسی حکومت شکسپیر کی عزت کر سکتی ہے؟ آئینسٹائن ٹولر اور رمان کو جرمنی سے نکال دیا گیا تھا۔ ان کی کتابیں سر بازار پھونک ڈالی گئی تھیں۔ ہمارے ملک میں شروعات ہوئی ہے۔ ٹیگور سے شکسپیر اور عوامی تھیٹر پر پابندی سے اور علی سردار کی گرفتاری سے۔

"ہم ودیارتھیوں کے سامنے یہ سب واقعات ہیں اور اب ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سرکار کدھر جا رہی ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے ہم نے اس رجعت پسند تعلیم دشمن عوام دشمن پالیسی کے خلاف آواز اٹھائی اور صرف اس سال میں ۲ لاکھ طلبا نے فیس کی کمی کے لئے جنگ کی۔ ایک لاکھ طلبا نے صرف کلکتے میں شہری آزادی اور تشدد کے خلاف جنگ کی اور اپنے نوجوان ساتھیوں کی قربانی دی۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمیں آئندہ بھی زبردست جنگ کرنی پڑے گی ۔۔۔ ہمارے کلچر اور تعلیم پر حملہ ہو رہا ہے اس کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ ایک ہو کر مستعدی سے لڑ کر۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ سردار جعفری کی گرفتاری ہو، ٹیگور پر پابندی ہو یا اسکولوں میں فیس کی زیادتی ہو ۔۔۔ یہ سب ایک ہی پالیسی کے مختلف رخ ہیں ۔۔۔ وہی عوام دشمن پالیسی۔ سرمایہ داروں کے فائدے کے لئے عوام کو جاہل رکھو، ان کے کلچر اور ادب کو کچل دو، اور ان کے دکھ درد کے پہچاننے والے ادیبوں اور شاعروں کی زبانوں پر تالے لگا دو، پھر شاید ان کا پیٹ کاٹنا آسان ہو جائے گا۔

"ابھی ابتدا ہے اس حملے کی جو ترقی پسند کلچر کی تحریک پر ہونے والا ہے۔ یہ حملہ ہندستان کے تمام ترقی پسند دانشوروں اور فن کاروں کو ایک چیلنج ہے اور دعوت عمل ۔۔۔ ایک بات صاف ہے کہ تمام دانشوروں اور فن کاروں کو جد و جہد کرنے کے لئے آمادہ ہونا پڑے گا ۔۔۔ کیا اب بھی کوئی ترقی پسند یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم کو جد و جہد نہیں کرنی ہے ۔۔۔ ہم ودیارتھی اپنا معمولی سا تجربہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اس امید کے ساتھ کہ یہ مفید ثابت ہوگا۔

"ہم کو پورا بھروسہ ہے کہ ہمارے ترقی پسند مصنفین جو جمہوریت اور آزادی کی جنگ کے لئے صف آرا ہو چکے ہیں اس جنگ میں تمام فن کاروں اور دانشوروں کی رہنمائی کریں گے۔ ہماری لڑائی بھی ایک ہونی چاہیے۔ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن اس جنگ میں کود چکی ہے، اور آپ کا پوری طرح ساتھ دے گی۔"

عوامی تھیٹر ایسوسی ایشن اور انجمن محبان سویت نے بھی احتجاجی تجویز منظور کی۔ ڈاکٹر ملک راج آنند، خواجہ احمد عباس راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، وشوا متر عادل، اور ساغر نظامی نے اپنے اخباری بیانات میں کہا کہ "ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ماہم کے مشاعرے میں صرف وہ نظمیں پڑھی گئی تھیں جو ملک کے متعدد ادبی رسائل میں بار بار چھپ چکی ہیں اور ہمارے شاعروں نے یہ نظمیں سنا کر اپنے ترقی پسند فرائض کی تکمیل کی ہے۔ سامراجی سازشوں اور غداریوں کا بھانڈا پھوڑنا، ان کے بغل بچوں، نفع خوروں، اور چور بازار کرنے والوں کے کرتوتوں پر لعنت کرنا کسی بھی طرح ملک اور عوام کے مفاد کے خلاف نہیں ہو سکتا، ان نظموں میں فرقہ پرستی کی بو بھی نہیں تھی، سردار جعفری کی صدارتی تقریر زبان کے مسئلے پر انجمن ترقی پسند مصنفین کی پالیسی کی تشریح تھی، جو ہندو مسلم، سکھ ادیبوں نے مل کر بنائی ہے . . . . ہم محسوس کرتے ہیں کہ حکومت ترقی پسند مصنفین کی بڑھتی ہوئی تحریک پر حملہ کرنا چاہتی ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ حکومت اس میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تشدد کے ذریعے سے عوامی آرٹ اور تہذیب کو نہیں کچلا جا سکتا . . . . . . ہم حکومت کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ترقی پسند مصنفین اس حملے کو برداشت نہیں کریں گے، اور اس وقت تک اپنا ایجی ٹیشن جاری رکھیں گے جب تک ان کے مطالبات پورے نہ ہو جائیں۔"

۳۱ر جنوری کی شام کو انجمن ترقی پسند مصنفین، عوامی تھیٹر ایسوسی ایشن، انجمن محبان سوویت، آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور فریڈم آف دی پریس کمیٹی کی طرف سے ایک عام جلسہ ہوا جس میں ڈاکٹر ملک راج آنند، خواجہ احمد عباس، ساغر نظامی، بلراج ساہنی اور سلطان نیازی نے تقریریں کیں،

ڈاکٹر ملک راج آنند نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "آج سے جعفری کا شمار دنیا کے ان شاعروں میں ہے جو سرمایہ داری، شہنشاہیت اور فاشزم کے خلاف جد و جہد کر رہے ہیں،

اس تاریک زمانے میں دنیا کے بہت سے ملکوں میں جہاں کی حکومت پولس کے ہاتھ میں ہے شاعروں اور ادیبوں کی خدمات کا اعتراف انھیں گرفتار کر کے کیا جا رہا ہے۔ اس لئے جعفری کو اپنی گرفتاری پر افسوس نہیں ہوگا۔ اس نے فرقہ پرستی کا زہر نہیں پھیلایا ہے۔ بلکہ سماجی انصاف کا مطالبہ کیا ہے۔

"ہمارے ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کچھ عجیب و غریب چیز نہیں ہے۔ دنیا کی دوسری سرمایہ دار حکومتیں بھی یہی کر رہی ہیں امریکہ کے اسکولوں میں اب ان استادوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے جو کمیونسٹ ہیں یا کمیونسٹوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ وہاں کی حکومت نے ایماندار اور مخلص انسانوں کی زندگی حرام کر دی ہے، ان پر روزی کمانے کے دروازے بند کئے جا رہے ہیں ہالی ووڈ کے ترقی پسند فن کاروں اور ایکٹروں پر مقدمہ چلایا جاتا ہے ہمارے ملک کی حکومت بھی امریکی شہنشاہیت کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو یورپ میں تھے تو ان سے وہاں کہا گیا تھا کہ آپ کے ملک میں پولس کا راج ہے۔ آج ان کی حکومت نے جو شرمناک حرکت کی ہے اس سے یہ الزام ثابت ہو جاتا ہے۔

• ہندستان کے تمام ترقی پسند عناصر نے قانون تحفظ عامہ کی مذمت کی ہے۔ حد یہ ہے کہ کلکتہ ہائی کورٹ اور بمبئی ہائی کورٹ کے بڑے ججوں کی تنقید پر بھی حکومت نے دھیان نہیں دیا۔ حکومت کو اس سے اندازہ کر لینا چاہئے کہ اس قسم کے قوانین اور پولس کی دراز دستیوں کے بارے میں عام رائے کیا ہے۔ اس ملک کے لوگ جانتے ہیں کہ انھیں اس غیر جمہوری قانون کے خلاف لڑنا ہے۔ انھیں یہ معلوم ہے کہ اس جد و جہد میں ان پر تشدد ہوگا۔ لیکن وہ بے باکی سے لڑتے رہیں گے، سردار جعفری بھی ان سپاہیوں میں سے ایک ہے۔

• ترقی پسند ادیبوں نے ہندستان کی ہر زبان میں ادب کے دھارے کا رخ موڑ دیا ہے۔ اس تحریک کی تنظیم میں سردار جعفری کا بہت حصہ ہے اور حکومت نے تحریک کی اہمیت کو محسوس کر کے سردار جعفری کو گرفتار کیا ہے۔ حکومت جانتی ہے کہ جعفری کی پوزیشن پولس کی طاقت سے کہیں زیادہ بڑی ہے جعفری کی آواز، شاعری کی پرسوز آواز ہے، جس کا اثر دوسری تحریروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ محنت کش اس آواز کے اثر سے واقف ہیں۔ چونکہ جعفری ایک عوامی شاعر ہے اس لئے اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ لیکن کوئی قوت شاعری کی آواز کو نہیں دبا سکتی، مشین گنیں بھی اس روشنی کو نہیں بجھا سکتیں جس کی نمائندگی جعفری یا دوسرے شاعر کرتے ہیں۔ جعفری کی شاعرانہ آواز بار بار ہمارے کانوں میں گونجے گی اور ایک دن خود جعفری بھی ہمارے پاس واپس آ جائے گا۔"

عوامی تھیٹر ایسوسی ایشن کے نمائندے کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے بلراج ساہنی نے کہا کہ "جب ۱۹۴۷ء میں ترقی پسند مصنفین اور عوامی تھیٹر نے امن اور شانتی کا جلوس نکالا تھا۔ تو جعفری بھی اس میں پیش پیش تھا، لیکن آج جعفری فرقہ پرست اور مجرم قرار دیا جاتا ہے اور گاندھی جی کے قاتلوں کا شمار محبان وطن میں ہوتا ہے۔ ہمارا کام صرف تجویزیں منظور کرنا اور رہائی کا مطالبہ کرنا نہیں ہے۔ ہمیں عوام کے پاس جانا چاہئے، اور ان سے کہنا چاہئے کہ تم ہمارے رہنما ہو، ہم تمہارے ساتھ مل کر جد و جہد کریں گے، آج نہ سیاست میں کوئی تیسری طاقت ہے

نہ ادب میں۔"

ساغر نظامی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "سردار جعفری کی گرفتاری کی خبر سن کر مجھے وہ آزاد کانفرنس یاد آگئی جو چند سال پہلے دہلی میں منعقد ہوئی تھی، اس کانفرنس میں یہ حضرات بھی موجود تھے جو آج حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس وقت وہ ہم سے ایسی نظمیں کہنے اور سنانے کا مطالبہ کرتے تھے جو عوام کو بیدار کر دیں اور ان کے جذبات میں آگ لگا دیں۔ ہم نے اس جدوجہد میں حصہ لیا۔ شاعروں نے آزادی کی لڑائی لڑی انھوں نے اس جنت کے خواب دیکھے جسے مکمل آزادی کہتے ہیں۔ جہاں ہمیں تحریر و تقریر اور عمل کی آزادی ہوگی، جن لوگوں نے اس جدوجہد میں اپنی جان دی ہے وہ اگر زندہ ہو جائیں تو آج کی حالت دیکھ کر انھیں بڑی تکلیف ہوگی، آج ہم سے وہ آزادی چھینی جا رہی ہے جس کے لئے ہم اب تک لڑتے رہے ہیں۔ جعفری کی گرفتاری نے ہمارے دلوں پر عجیب و غریب اثر کیا۔ یہ ایک چیلنج ہے اس نے ہماری آنکھوں سے پردے اٹھا دئے ہیں، اور حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے، جعفری کی گرفتاری نے ادیبوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا ہے کہ ہم کس قسم کی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ جعفری کو گرفتار کر کے حکومت نے بڑی سخت غلطی کی ہے اور اس دراز دستی کے خلاف ہم سب مل کر جدوجہد کریں گے۔"

خواجہ احمد عباس نے "شاعر کی آواز" کے نام سے ایک کہانی سنائی، جو آئندہ صفحات میں شائع کی جا رہی ہے اور آخر میں کہا کہ "میں بمبئی کی سی۔ آئی۔ ڈی۔ کے ذریعے یہاں کے ہوم منسٹر کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ تنہا سردار جعفری کی گرفتاری نہیں ہے بلکہ حکومت نے ڈاکٹر ملک راج آنند، بلراج ساہنی، احمد عباس، ساغر نظامی، رمیش سنہا۔ سب کو سردار کے ساتھ گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا ہے، یہاں بیٹھے ہوئے مجمع کا ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی آج گرفتار ہے۔ اس ملک کے تمام شاعر گرفتار ہیں۔ صرف زندہ شاعر ہی نہیں بلکہ جو مر چکے ہیں وہ بھی، غالب اور اقبال، ٹیگور اور شکسپیر سب گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ آج دنیا کا ہر وہ شاعر جس نے آزادی کے لئے آواز بلند کی ہے، سردار جعفری کے ساتھ محبوس ہے اگر یہاں کوئی ایسا قانون ہے جس کے تحت سردار جعفری کو پکڑا جا سکتا ہے تو پھر ہم میں سے ہر شخص کو بغیر وارنٹ کے گرفتار کیا جا سکتا ہے، ہم اس صوبے اور اس ملک کی حکومت سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر کب تک جاہل اور غیر مہذب پولس ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو گرفتار کرتی رہے گی، کیونکہ یہ صرف سردار جعفری کا نہیں بلکہ ٹیگور کا بھی سوال ہے۔ ہم سردار جعفری کی گرفتاری کے خلاف سخت احتجاج کرتے ہیں اور حکومت سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر تم پولس سے یہ کام لے رہے ہو کہ شاعروں اور ادیبوں کی فکر و نغمے کا گلا گھونٹے تو نہ تمہاری حکومت حکومت ہے نہ تمہاری جمہوریت جمہوریت۔"

آخر میں احمد عباس نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آج جب آپ سردار جعفری کی گرفتاری کے خلاف آواز بلند کر رہے ہو تو آپ کو ان تمام قوانین کے خلاف آواز بلند کرنی چاہئے جن کے ذریعے سے شاعروں اور ادیبوں کو کچلا جا رہا ہے۔"

محبان سویت کی انجمن کی طرف سے تقریر کرتے ہوئے ادھیکاری نے کہا کہ "شاعر کی آواز کو کون دبا سکتا ہے۔ جو لوگ آج تہذیب کا گلا گھونٹ رہے ہیں انھیں تاریخ کا یہ اتنا سبق نہیں بھولنا چاہئے۔"

اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے سلطان نیازی نے تقریر کی اور ان باتوں کو تفصیل سے بیان کیا جو اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے اپنے پیغام میں انجمن ترقی پسند مصنفین کو لکھ کر بھیجی تھی۔

آخر میں جلسے نے متفقہ طور سے ایک تجویز منظور کی جس میں سردار جعفری کی غیر مشروط رہائی اور کیفی اعظمی اور نیاز حیدر کے خلاف وارنٹ واپس لینے کا مطالبہ کیا گیا۔ اور کہا گیا کہ "یہ جلسہ تمام ترقی پسند ادیبوں اور فن کاروں طلبا، اور ملک کے عوام سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس رجعت پرست پالیسی کے خلاف اور ترقی پسند تحریک کی حفاظت کے لئے متحد ہو کر جدوجہد کریں اور ادیبوں اور شاعروں کے لئے ان کا یہ حق حاصل کریں، کہ وہ عوام کے لئے لکھ سکیں اور عوام کے گیت گا سکیں۔"

اسی قسم کی احتجاجی تجویزیں کلکتہ، دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، میرٹھ، فتح گڑھ، پٹنہ، رانچی، سمستی پور، احمد نگر بھوپال، احمد آباد، اور ہندستان کے دوسرے مقامات کی شاخوں نے منظور کر لیں۔ اور ان کی نقلیں بمبئی کے ہوم منسٹر شری مرار جی ڈیسائی کے پاس بھیج دیں۔

الہ آباد سے ہندی اور اردو کے ۳۲ شاعروں، ادیبوں، اور یونیورسٹی کے پروفیسروں نے ایک بیان جاری کیا، جس میں حکومت کے اس فعل کی سخت مذمت کی۔ ان میں خاص طور سے قابل ذکر نام یہ ہیں سمترا نندن پنتھ، رگھوپتی سہائے فراقؔ، ہربنس رائے بچن، واتسائن آگیہ، اوپندر ناتھ اشک، پہاڑی، نروتم ناگر، ڈاکٹر اعجاز حسین، پی۔ سی گپتا، نیمی چند جین، ناگ ارجن، دیوندر ناتھ اسر، سوریہ دت دوبے، آشارام صدیقہ بیگم سیوہاروی، اطہر پرویز وغیرہ۔

فراقؔ گورکھپوری نے ایک الگ بیان بھی جاری کیا، اور احتجاجی جلسے کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ "ہمیں آج صرف احتجاج ہی نہیں کرنا ہے بلکہ غصّے اور نفرت کا اظہار کرنا ہے کیونکہ جب ادب اور تہذیب اور ادیبوں پر حملے شروع ہو جاتے ہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ حکومت تنقید کی حد سے آگے گذر چکی ہے اور اس کا عمل غیر مہذب اور جاہلانہ ہے۔"

بھوپال کی مقامی انجمن نے اپنی سالانہ کانفرنس میں شاعر انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے زیر صدارت جو احتجاجی تجویز منظور کی اس میں، اور بہت سی باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا گیا کہ "انڈین یونین اور اس کے صوبوں کی نام نہاد عوامی حکومتوں نے آزادی ملنے کے بعد ہی نہ صرف ترقی پسند سیاسی تحریکات پر بلکہ ادبی، سماجی، اور تمدنی اداروں پر بھی حملہ شروع کر دیا ہے، ادیبوں کی وہ تخلیقات بھی برداشت نہیں کی جا رہی ہیں۔ جن میں عوام کی حالت اور ان کے حقوق کا تذکرہ ہو۔ . . . . . . بمبئی کی حکومت کا اقدام ثابت کرتا ہے کہ اب اس نے براہ راست انجمن ترقی پسند مصنفین پر حملہ شروع کر دیا ہے اور اب وہ نہ صرف جلسہ، جلوس، تحریر اور تقریر پر بلکہ خیالات پر بھی پابندی عائد کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگی ہے، یہ ضرورت وہی حکومتیں محسوس کرتی ہیں۔ جن کی پالیسی غیر جمہوری، اور جن کا کردار غیر عوامی ہو" اس تجویز میں تحریر و تقریر کی مکمل آزادی کا پر زور مطالبہ کیا گیا۔

یہ ان کارروائیوں کی ایک مختصر سی روداد ہے جو حکومت بمبئی کی غیر جمہوری حرکت کے خلاف ترقی پسند ادیبوں اور فن کاروں نے گذشتہ پندرہ دن میں کی ہیں۔ یہ ہماری ترقی پسند تحریک کی بڑھتی ہوئی طاقت کا ثبوت ہے اور اس کا اعلان ہے کہ ترقی پسند ادیب اور فن کار رجعت پرستی کے خلاف اپنی جدوجہد کو پوری شدت کے ساتھ چلاتے رہیں گے، شعر و نغمے کی آواز لافانی ہے، اور فکر و خیال کی آزادی کو جبر و تشدد کے ذریعے اسیر نہیں کیا جا سکتا۔

سردار جعفری کی رہائی پر بمبئی کے انگریزی روزنامے فری پریس بلیٹن نے اپنی ۱۱ فروری کی اشاعت میں جو اداریہ لکھا ہے اس میں شہری آزادی کے اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

"ہندستان نے آزادی کے لئے جدوجہد کی ہے اور وہ جمہوریت کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہمارا دستور بنانے والوں کا یہ کہنا ہے کہ نیا دستور افراد کے ان بنیادی حقوق کے تحفظ کا وعدہ کرتا ہے، جس کے بغیر کوئی ریاست جمہوری کہلانے کی مستحق نہیں ہے، لیکن اکثر قول اور فعل میں فرق پایا جاتا ہے، آج ہر صوبے میں وہ قانون نافذ ہے جس کا نام "قانون تحفظ عامہ" ہے اور اسی قانون کے ماتحت کسی بھی شخص سے ذرا سے شبہے پر اس کی ذاتی آزادی چھینی جا سکتی ہے، اور اس شخص کو پولس کی غلط کاریوں کے خلاف احتجاج کرنے کا بھی موقع نہیں باقی رہتا۔ . . . ان اختیارات کے استعمال پر کئی صوبوں کے ہائی کورٹ تک احتجاج کر چکے ہیں، ایسی بھی مثالیں ہیں کہ عدالتوں

کے پاس جو محدود اختیارات رہ گئے ہیں وہ بھی کسی شخص کو محفوظ رکھنے کے لئے ناکافی ہیں اور اپنی بے جا قید کے خلاف وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی سب سے قریبی مثال سردار جعفری کی گرفتاری ہے . . . . ۱۴ فروری کو سردار جعفری کو رہا کر دیا گیا۔ شاید پولس کے پاس ان کے خلاف کوئی چیز نہیں تھی، کیا یہی ہے فرد کی وہ آزادی جس کے لئے گاندھی جی نے جدوجہد کی تھی؟ کیا یہی جمہوریت ہے؟ کیا بنیادی حقوق کی حفاظت اسی کا نام ہے؟ اگر ایک فرد پر بھی بے جا جبر کیا جاتا ہے تو جمہوری حکومت کے تمام دعوے بیکار ہو جاتے ہیں . . . .

"اگر گاندھی جی کے نقش قدم پر چلنے کا دعوٰی کرنے والی اس حکومت میں اپنے اصولوں پر قائم رہنے کی ہمت ہے تو اسے فوراً سردار جعفری کی گرفتاری پر پولس کی تحقیقات کرنی چاہئے اور ان افسروں سے باز پرس کرنی چاہئے جنھوں نے اپنے اختیارات کا بے جا استعمال کیا ہے۔ کسی شخص کی ذاتی آزادی چھیننے کے بعد اس کی تلافی نہیں کی جا سکتی، لیکن اگر حکومت جمہوری روایات کو پھلنے پھولنے کا موقع دینا چاہتی ہے تو اسے کم سے کم عوام کے سامنے اپنی صفائی ضرور کرنی چاہئے۔"

ادیبوں کی گرفتاری پر

نیاز حیدر

زندگی جس کا ترانہ، جس کا نغمہ ہے فروغ — "دس نہیں سکتا اسے سرمایہ داری کا دروغ

راون و بوجہل کے قانون کی تاثیر کیا — کیا ہے یہ سولی، یہ مجلس اور یہ زنجیر کیا

ظلم کی آندھی چلانے والی قدرت بد دماغ — ایسی پھونکوں سے نہیں بجھتا صداقت کا چراغ

غالب و اقبال کی پرواز ہو کیونکر اسیر — کیا کماں سے جست کر کے لوٹتا ہے کوئی تیر

عصر نو عصر کہن میں یوں بدل سکتا نہیں — دوست بندر بھبکیوں سے کام چل سکتا نہیں

نام پر قانون کے یہ ظلم رانی تا بہ کے — سامراجی طرز کی ایذا رسانی تا بہ کے

جس کی نظروں میں ہو لینن اور ستالن کا وقار — جس کی آنکھوں کا تبسم مژدۂ فصل بہار

اب اسے طوق و سلاسل سے ڈرا سکتا ہے کون — خالق رفتار کو بیڑی پہنا سکتا ہے کون

مسکراتا ہے سویرا مثل روئے مالو تاف — کھل گیا در، پڑ گیا دیوار زنداں میں شگاف

اب قفس میں جنبش صد بال و پر ہونے کو ہے"

ہماری تحریک

آج تین ماہ بعد انجمن کی رپورٹیں نیا ادب میں شائع ہو رہی ہیں۔ دسمبر کے پرچے کے لئے رپورٹیں موصول نہیں ہوئی تھیں۔ جنوری اور فروری کا شمارہ خاص نمبر تھا۔ اس لئے تمام رپورٹیں مارچ کے پرچے کے لئے روک لی گئی تھیں۔ اس بار ہم بیرہ شاخوں کی رپورٹیں چھاپ رہے ہیں، احمد نگر اور فیروز پور کی رپورٹیں بہت پرانی ہو چکی ہیں اس لئے شائع نہیں کی جا رہی ہیں۔ کشمیر، حیدر آباد، بھوپال، دہلی، جالندھر اور الہ آباد سے رپورٹیں موصول نہیں ہوئیں۔ کانپور میں دو انجمنیں قائم ہیں اس لئے وہاں کی رپورٹوں کی اشاعت روک دی گئی ہے، ان کے اختلافات جلد طے ہو جانے کی امید ہے۔ اس کے بعد وہاں کی رپورٹیں باقاعدہ چھپتی رہیں گی،

بمبئی کی شاخ کے علاوہ باقی تمام شاخوں کی رپورٹیں دسمبر جنوری تک ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ تمام شاخیں اپریل کے پرچے کے لئے جنوری اور فروری اور نصف مارچ کی مفصل رپورٹیں روانہ کریں گی،

مرکز کی طرف سے تمام شاخوں کے نام ایک سرکلر بھیجا گیا ہے جس کو ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

۵ مارچ ۱۹۴۹ء

برادرم تسلیم۔ اس کی اطلاع آپ کو پہلے دی جا چکی ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کی شاخ بمبئی نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اردو کے ترقی پسند مصنفین کی تیسری سالانہ کانفرنس مئی ۱۹۴۹ء کے کسی ہفتے میں بمبئی میں بلائی جائے۔ کانفرنس کے تمام انتظامات کرنے کے لئے بمبئی کی شاخ نے اپنی خدمات پیش کی ہیں اور ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے۔ جس نے چندہ جمع کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ کانفرنس کی صحیح تاریخوں کی اطلاع وسط اپریل تک مل جائے گی۔ مکمل پروگرام بھی اسی وقت تیار ہوگا۔

اس کانفرنس کے پیش نظر تین چیزیں ہیں:۔

۱۔ گذشتہ پندرہ سال کے ترقی پسند ادب کا جائزہ

۲۔ موجودہ حالات میں ادب اور تہذیب کی حفاظت کا سوال

۳۔ تنظیمی مسائل اور نیا ادب

اس وقت ہندستان میں اردو کی ۲۲ شاخیں کام کر رہی ہیں۔ اس کانفرنس میں ہر شاخ کو کم سے کم دو نمائندے ضرور بھیجنے چاہئیں جن میں سے ایک مقامی انجمن کا سکریٹری ہو، ان کے علاوہ جتنے ادیب آسکیں اتنا ہی اچھا ہے، ہر ادیب جو انجمن کا ممبر ہو کانفرنس میں شریک ہونے اور ووٹ دینے کا حقدار ہے، آپ اپنی مقامی انجمن میں طے کر کے اطلاع دیجئے کہ آپ کے یہاں سے کتنے حضرات کانفرنس میں شریک ہوں گے آپ اپنی شاخ سے کتنے مقالوں کا انتظام کر سکیں گے، مقالہ نگاروں کے نام اور موضوعات کی اطلاع پہلی اپریل ۱۹۴۹ء تک مل جانی چاہیئے،

ہم اس کانفرنس میں ہندی کے مشہور ادیبوں اور پاکستان کے ایک ادبی وفد کو بھی دعوت دے رہے ہیں۔

مجلس صدارت پانچ چھ ادیبوں پر مشتمل ہوگی، جن میں ہم ایک دو ہندی ادیبوں کو شامل کرنا چاہتے ہیں۔ مجلس صدارت

کے ناموں کا فیصلہ انجمن کی تمام شاخوں کے مشورے سے کیا جائے گا۔ امید ہے کہ آپ اپنی مقامی انجمن کا جلسہ کر کے مجلس صدارت کے لئے نام تجویز کر دیں گے اور ہمیں پہلی اپریل ۱۹۴۹ء تک اطلاع دے دیں گے۔

اپنی انجمن کے جلسے میں یہ خط پڑھ کر سنا دیجئے اور اپنے مشوروں سے مرکز کو مطلع کر دیجئے، یہ بھی تحریر کیجئے کہ سفر خرچ کے لئے آپ کو مرکز سے کسی قسم کی امداد کی ضرورت ہوگی یا نہیں۔ اگر آپ خود انتظام کر سکیں تو بہت اچھا ہے، بمبئی میں آپ حضرات کے رہنے اور کھانے کا انتظام ہم کر رہے ہیں۔

اس سلسلے کی ساری خط و کتابت ممتاز حسین۔ ۷ سیکری بھون۔ ۹۶۔ والکیشور روڈ، ملا بار ہل، بمبئی کے پتے پر کیجئے۔

آپ کا

سردار جعفری

شاخ بمبئی

جنوری ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی کے نئے انتخابات ہوئے جن میں حسب ذیل عہدیدار اتفاق رائے سے منتخب کئے گئے۔ کیفی اعظمی (سکریٹری)، مہندر ناتھ (جائنٹ سکریٹری)، ساغر نظامی (خزانچی) ان کے علاوہ مجلس عاملہ میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز حسین اور وشوامتر عادل ہیں، خواجہ احمد عباس مرکزی انجمن کے جائنٹ سکریٹری اور سردار جعفری اردو کے آرگنائزنگ سکریٹری کی حیثیت سے مجلس عاملہ میں شامل ہیں۔

پچھلے چند مہینوں میں بمبئی کی انجمن میں تین بڑے اہم مباحثے ہوئے۔ ایک میراجی کی شاعری اور رسالۂ خیال کی پالیسی کے متعلق تھا۔ دوسرا سعادت حسن منٹو کی نئی کتاب سیاہ حاشیے کے متعلق اور تیسرا ساغر نظامی کے رسالۂ ایشیا کی پالیسی کے متعلق۔ ان کے علاوہ متعدد مقالے نظمیں اور افسانے پڑھے گئے اور ڈاکٹر ملک راج آنند نے پولینڈ میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی ادیبوں کی کانفرنس پر رپورٹ دی، جہاں سے وہ حال ہی میں واپس آئے ہیں، اس کانفرنس کا اعلان نامہ نیا ادب کی پچھلی اشاعتوں میں چھپ چکا ہے۔

رسالۂ خیال کی پالیسی پر مباحثہ تین ہفتے تک جاری رہا۔ دسمبر میں خیال کا پہلا پرچہ میراجی، اختر الایمان اور مدھوسودن کی ادارت میں شائع ہوا تو انجمن کے ممبروں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ترقی پسندی اور صحت مند ادب کے نام پر میراجی کی گندی شاعری اور بیمار اور انحطاط پذیر ادبی نظریات کی ترویج کی گئی ہے، اس کے اداریے میں بھی کچھ اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔ گویا اردو کے ادیبوں کے لئے ایک نیا مرکز بنانے کی ضرورت ہے آزادی خیال کے بارے میں بھی یہ رویہ تھا کہ پرچے میں ہر طرح کی چیزیں چھاپی جائیں گی، اور اس آزادی کا فائدہ میراجی نے پوری طرح اٹھایا تھا۔ سب سے زیادہ قابل اعتراض چیز میراجی کی ایک نظم تھی جو فحش نگاری اور گندگی کا شاہکار تھی، اس پرچے پر وشوامتر عادل نے ایک تبصرہ پڑھا اور مقامی انجمن نے ایک تجویز کے ذریعے سے اختر الایمان اور مدھوسودن سے درخواست کی کہ وہ پرچے کی پالیسی کو بدلنے کی کوشش کریں اور اپنے آپ کو میراجی اور اس قسم کے دوسرے رجعت پرست اور غیر صحت مند عناصر سے الگ کریں۔

خیال کا دوسرا پرچہ پہلے پرچے سے بھی زیادہ رجعت پرستی کا حامل تھا۔ اداریہ میں پرانا خیال پھر ظاہر کیا گیا تھا۔ اور بعض جگہ تاریخی غلطیاں بھی تھیں جو جان بوجھ کر دھوکا دینے کے لئے کی گئی تھیں۔ مثلاً فرانس کے انحطاطی شاعر بودلیر کے لئے یہ لکھا گیا تھا کہ اب بعض مغربی نقاد اس کی شاعری میں ترقی پسند عناصر ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، بودلیر کی ایک نظم کے ترجمے میں ۱۷۸۹ء کی تاریخ کو بدل کر بیسویں صدی کی جمہوریت اور آزادی کے الفاظ لکھ دیئے گئے تھے، حالانکہ بودلیر بیسویں صدی کے آنے سے پہلے ہی مر چکا

تھا، مضامین اور نظموں کے انتخاب میں بھی رجعت پرستی کی پوری پوری چھاپ تھی، بودلیر کی رجعت پرست نظموں کے ترجموں کے علاوہ ایک مضمون سائنس پر تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ انسان اس کائنات میں ایک بے بس ہستی سے زیادہ نہیں اور ایک دن یہ دنیا ختم ہو جائے گی، اس مضمون میں انسان کی بے بسی پر خوب جی کھول کر ماتم کیا گیا تھا، اور زندگی کے بجائے موت کی بھیانک تصویر کھینچی گئی تھی، سنسکرت ادب کے انحطاطی دور کے ایک فحش نگار شاعر دامودر گپت کا ایک طویل ترجمہ تھا۔ جو ادب اور شاعری کے بجائے کوک شاستر سے زیادہ قریب تھا۔ عذر یہ تھا کہ یہ ترجمہ ہماری اور آپ کی عبرت کے لئے چھاپا گیا ہے جیسے کوئی جرکین اور جان صاحب کا کلام عبرت کے لئے نشر کرے۔ ممتاز شیریں کی ایک انتہائی رجعت پرست کہانی تھی۔ جس میں پنجاب کے فسادات اور قتل و غارت گری کو بچہ جننے والی ماں کے خون سے تشبیہ دی گئی تھی، ایک نظم تھی جس میں دشمن سے محبت کرنے کی تلقین تھی، غرض پورے پرچے پر رجعت پرستی حاوی تھی۔

تین ہفتے تک بڑی گرما گرم بحثیں ہوتی رہیں۔ مباحثے پانچ پانچ گھنٹے ٹھمک جاری رہے، اس بحث میں راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، احمد عباس، ساغر نظامی، ممتاز حسین، سردار جعفری، محمد مہدی، رشوامتر عادل، موہوسودن، اخترالایمان، مہندر ناتھ، کیفی اعظمی، اور بہت سے ادیبوں نے حصہ لیا، عباس کا کہنا یہ تھا کہ ہمیں اس رجعت پرستی پر صرف تنقید کرنی چاہیے، لیکن میراجی اور اخترالایمان کو پورا حق ملنا چاہیے کہ وہ آزادیٔ خیال کے نام پر اپنے رجعت پرست نظریات کی تبلیغ کریں، مہدی نے عباس سے سوال کیا کہ پھر آپ نے اس آزادیٔ خیال کا حق آر۔ ایس۔ ایس کو کیوں نہیں دلوایا۔ بتائیے اگر آپ کے باغ میں سانپ آجائے تو آپ کیا کریں گے، اس کا جواب عباس کے بجائے کرشن چندر نے دیا۔ اور بڑے طنز سے کہا "صرف تنقید کریں گے"، سردار جعفری نے بتلایا کہ آج ادب میں تفریق کا وقت آگیا ہے، اور یہ تفریق ہم نے نہیں بلکہ ہمارے دشمنوں نے شروع کی ہے۔ اس وقت ترقی پسند اور رجعت پرست طاقتیں ٹکرا رہی ہیں اور اس ٹکراؤ میں کوئی ادیب غیر جانبدار نہیں رہ سکتا، اسے کسی ایک طاقت کا ساتھ دینا پڑے گا۔ جرمنی میں ہٹلر نے کہا کہ جو فاشزم کا حامی نہیں ہے وہ دشمن سمجھا جائے گا اور غیر جانبداری بے معنی ہو کر رہ گئی۔۔۔ ، ہندستان اور پاکستان میں بھی، رجعت پرست طاقتوں نے ہم پر حملہ شروع کر دیا ہے، اور اس لئے آج ہمیں اپنی سمتوں کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ ایسے موقع پر وہ ادب زہر ہے، جو ترقی پسندی کے نام پر رجعت پرستی اور انحطاط کا زہر پھیلاتا ہو، ہم نہیں چاہتے کہ اس گندے مقصد کے لئے ترقی پسند تحریک یا ادیبوں کے نام باربرداری کے جانوروں کی طرح استعمال کئے جائیں اور ان کی پیٹھ پر رجعت پرستی کا بوجھ لاد کر بازار ے جایا جائے، اگر خیال میراجی کے انحطاط اور رجعت پرستی کا ترجمان ہے تو وہ انھیں کے نام سے بکے، اس میں کرشن چندر اور بیدی کی چیزیں نہیں ہونی چاہئیں۔ کیونکہ میراجی سے کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔ یہ تو کرشن کے نام پر میراجی کی گندگی کی تبلیغ ہے۔

آخر اخترالایمان نے یہ تسلیم کیا کہ میراجی رجعت پرست ہیں۔ خیال کی پالیسی رجعت پرست رہی ہے، اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ اس کی پالیسی کو بدلیں گے، اور میراجی کو اس پر اثر انداز نہیں ہونے دیں گے، اس بنیاد پر انجمن نے ایک اور تجویز منظور کی کہ اخترالایمان کے وعدے کے پیش نظر ہم خیال کے ساتھ پھر تعاون کر کے دیکھیں گے۔

سعادت حسن منٹو کے سیاہ حاشیے پر دو تبصرے پڑھے گئے، ایک ممتاز حسین نے پڑھا اور دوسرا احمد عباس نے۔ ممتاز کے تبصرے کے بارے میں انجمن کا خیال تھا کہ منٹو کا تجزیہ بہت اچھا کیا گیا ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ منٹو کے فنی انحطاط پر ایک تفصیلی مضمون لکھنے کی ضرورت ہے۔ احمد عباس کے تبصرے کے متعلق یہ کہا گیا کہ اس میں شرافت زیادہ ہے اور ہر جگہ شرافت کام نہیں دیتی، اس تبصرے میں منٹو کو مظلوم بتایا گیا ہے اور حسن عسکری کو ظالم، اب حسن عسکری پر لعن طعن کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ہر فاشسٹ چکنا گھڑا ہوتا ہے اصل سوال یہ ہے کہ منٹو عسکری کا شکار کیسے ہوا اور یہی چیز اس تبصرے میں غائب تھی۔

ساغر نظامی کے ایشیا پر مجروح سلطان پوری نے تبصرہ کیا۔ مجروح نے کہا کہ اس پرچے میں ایک طرف حکومت کے وزرا اور گورنروں کے بیانات شائع ہوتے ہیں۔ جن کے راج میں طلبا پر گولیاں برستی ہیں، مدرسین پر لاٹھیاں چلائی جاتی ہیں، کتابیں اور اخبارات ضبط کئے جاتے ہیں اور درجنوں ادیب جیلوں میں بند کئے جاتے ہیں، دوسری طرف ان ادیبوں کے بیانات ہیں جو اس جبر و تشدد کے خلاف تہذیب اور ادب کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں، مکھرجی کہتے ہیں کہ ادب کو سیاست سے الگ کر دیجئے، ایس کے پاٹل کہتے ہیں کہ حکومت کو تقویت پہونچائیے، اور سر مہاراج سنگھ فرماتے ہیں کہ مادیت کے خلاف جنگ کیجئے، اس کے برعکس ممتاز حسین کا کہنا ہے کہ عقل اور سائنس کو فروغ دیجئے، اور کرشن کا کہنا ہے کہ ایشیائی انقلاب کا ساتھ دیجئے، ساغر صاحب بتائیں وہ کس کے ساتھ ہیں۔ ایس کے پاٹل اور مکھرجی کے ساتھ یا کرشن چندر اور ممتاز حسین کے ساتھ،

ساغر نظامی نے دوسرے جلسے میں اپنی صفائی پیش کی اور کہا کہ حکومت کے وزرا اور گورنروں کے بیانات ایشیا کی پالیسی پر اثر انداز نہیں ہوں گے، انجمن ایشیا کے نئے پرچے کی منتظر ہے۔

وشوامتر عادل

شاخ لکھنؤ

انجمن ترقی پسند مصنفین شعبۂ اردو کے جلسے پچھلے ڈیڑھ دو سال سے ہو رہے ہیں، ۵۳ء کے دوسرے نصف میں جلسے کچھ دن تک پابندی کے ساتھ ہوئے لیکن دسمبر ۵۳ء کی کل ہند کانفرنس کے بعد اس کی سرگرمیاں بہت کم ہو گئیں۔ گذشتہ اگست میں جلسے دوبارہ شروع کئے گئے اور مہینے میں دو ایک جلسے ضرور ہو جاتے تھے، نومبر میں نئے عہدیداروں کا انتخاب ہوا اور ایک نئی مجلس عاملہ بنائی گئی، یشپال جنرل سکریٹری، مکین احسن کلیم شعبۂ اردو کے سکریٹری اور آوت مصر شعبۂ ہندی کے سکریٹری مقرر کئے گئے، اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ فیصلہ بھی کیا گیا، کہ اردو اور ہندی کے شعبوں کو ایک دوسرے سے بے تعلق رکھنے کے بجائے ان کو مربوط اور ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس لئے یہ طے کیا گیا، کہ ہر مہینے کے پہلے اتوار کو اردو اور ہندی کے ادیبوں کا مشترکہ جلسہ ہوا کرے، دوسرے اتوار کو شعبۂ اردو کا اور تیسرے کو شعبۂ ہندی کا۔ اس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ہر جلسے میں کم از کم ایک مضمون ایسا ضرور پڑھا جائے جس سے اردو کے ادیب . . . . . . ہندی ادب سے اور ہندی کے ادیب اردو ادب سے قریب تر ہو سکیں۔

مذکورہ بالا فیصلے کو تین مہینے کے قریب ہو چکے ہیں پھر بھی نئے پروگرام پر ابھی تک باقاعدگی کے ساتھ عمل نہیں ہو سکا عملی حیثیت سے انجمن کا کام ناکافی ہی نہیں بلکہ ایک حد تک مایوس کن بھی ہے، ستمبر سے آخر جنوری تک ہمارے صرف آٹھ جلسے ہو سکے۔ پچھلے آٹھ جلسوں میں بھی جو مقالے پڑھے گئے، وہ کسی اسکیم یا منصوبے کے مطابق نہیں تھے، اور جن لوگوں سے تعاون کی زیادہ سے زیادہ امید تھی، انھوں نے بھی کسی خاص سرگرمی کا ثبوت نہیں دیا۔ یہ ضرور ہے کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ انجمن کے جلسے میں شعرا کی تعداد کافی ہوگی، اور سنجیدہ مباحثے کے بجائے مشاعرے کی فضا پیدا ہو جائے گی، تو حاضرین کی تعداد اچھی خاصی ہو جاتی ہے، لکھنؤ اس صوبے کا سب سے بڑا علمی اور ادبی مرکز ہے اور یہاں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کافی ہے پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ترقی پسندی کی تحریک کی اہمیت کو سمجھتے ہی نہیں حتیٰ کہ مجلس عاملہ کے جلسے کا بھی (جس کے ممبروں کی تعداد صرف چھ ہے) کورم پورا نہیں ہوتا۔ ان حالات کے پیش نظر یہاں زیادہ کامیابی کی امید بہت کم معلوم ہوتی ہے، پھر بھی ہماری کوششیں جاری ہیں۔

مکین احسن کلیم

شاخ علی گڑھ

اکتوبر ۴۸ء میں انجمن کے تین جلسے ہوئے جن میں دو مقالے، دو افسانے، چار غزلیں، ایک نظم اور دو گیت سنائے گئے۔

پہلا مقالہ خورشید الاسلام کا تھا۔ "شبلی خطوط کے آئینے میں" زہرہ خاتون نے اس پر اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ اس مقالے میں شبلی کی شخصیت کا تجزیہ نئے انداز سے کیا گیا ہے لیکن خورشید صاحب نے شبلی کی کمزوریوں اور ذہنی کجروی کو صرف ان کی ذات تک محدود کر دیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شبلی کی وہ کمزوریاں جن کی وجہ سے وہ نئے زمانہ کا ساتھ نہ دے سکے اور نئے اور پرانے کی کشمکش میں مبتلا رہے اور بالآخر قدامت پرستی کی طرف جھک گئے اس سب کا تجزیہ اس ماحول کے ساتھ کرنا چاہئے تھا۔ جس میں شبلی نے آنکھ کھولی اور ذہنی تربیت حاصل کی۔ شبلی نے مسلمانوں کے ایک ایسے گروہ کی نمائندگی کی جو یکسر قدامت پرست بھی نہیں تھا۔ جو علمائے دیوبند کو تنگ نظر بھی سمجھتا تھا۔ لیکن قدامت اور اسلاف کی روایات کو سینے سے لپٹائے بھی رکھنا چاہتا تھا۔ جو جمہوریت کا بھی قائل تھا۔ لیکن اس کی نظروں میں بغداد و قرطبہ کی شاہانہ عظمت اور زبیدہ کے محلات بھی گھوما کرتے تھے۔ وہ زمانہ ایسا تھا جب مسلمانوں کا روشن خیال طبقہ بھی نئی تہذیب اور سائنس کی ترقیوں سے خائف تھا، اور اسے حریم خلافت کی یاد ستاتی رہتی تھی، اس لئے خورشید صاحب کا تجزیہ نامکمل ہے۔

دوسرا مقالہ اسلوب احمد انصاری نے "شعری صداقت" پر پڑھا۔ یہ مقالہ کافی محنت سے لکھا گیا ہے اور اس میں شاعری کے متعلق ان بنیادی مسائل کو اٹھایا گیا ہے۔ جن پر اردو میں سرمایہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

افسانوں میں ابوالفضل صدیقی کا افسانہ "ٹکر" اور باقر مہدی کا افسانہ "کافر" پڑھا گیا۔ نظم صرف ایک پڑھی گئی، سید علی نقوی کی "ہم سفر"، اس کا پس منظر موجودہ سیاسی حالات اور نئی تحریکات ہیں۔ فرید بخش قادری، خلیل الرحمٰن اعظمی، آفتاب عالم اور ظہیر صاحب نے غزلیں پڑھیں، صاحب سنگھ مہرا نے دو گیت پندرہ اگست کے متعلق سنائے،

نومبر اور دسمبر میں انجمن کے چار جلسے اور دو مشاعرے ہوئے، ان جلسوں میں انجمن کے ممبروں کے علاوہ باہر سے آنے والے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں اور ہندی کے لکھنے والوں نے بھی شرکت کی، ان جلسوں میں چار تنقیدی مقالے پڑھے گئے جن میں سے تین بہت اہم ہیں۔

خورشید الاسلام نے امراؤ جان ادا پر مقالہ پڑھا۔ یہ بہت سیر حاصل تنقید ہے جو ۵۰ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے اور بجائے خود ایک کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے نہ صرف مرزا رسوا کے ناول کی فنی خصوصیات بیان کی ہیں بلکہ اس کے موضوع کا تعین اس کے کرداروں اور شخصیتوں کا نفسیاتی تجزیہ، ناول نگار کا شعور اور اس کے لکھنے کا مقصد اور اس کا تاریخی پس منظر بھی پیش کیا ہے۔

جذبی کی شاعری پر محمود الحسن نے ایک مقالہ پڑھا جس میں جذبی کی خصوصیات بیان کیں، اور اس کی یاسیت پر روشنی ڈالی۔

محمد مثنیٰ رضوی نے ایک نئے نقطۂ نظر سے اردو غزل کے نئے شعور پر روشنی ڈالی، اب تک جدید غزل کا تصور یہ تھا کہ مولانا حالی کے اعتراضات کے ردعمل کے طور پر حسرت، فانی، جگر وغیرہ کے ہاتھوں غزل ایک بار پھر جنم لیتی ہے اور اسی کو جدید اردو غزل کی تحریک کہتے ہیں لیکن محمد مثنیٰ نے اس نظریئے سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حسرت اور ان کے ساتھ کے شاعروں کی وجہ سے غزل میں ایک نیا پن ضرور آگیا ہے اور اب عشقیہ شاعری خیالی اور مصنوعی ہونے کے بجائے اصلی اور واقعی معلوم ہونے لگی ہے، لیکن اس کے باوجود ان شعراء نے بیان نہ تو روح

عصر ملتی ہے اور نہ ایسی شاعری جو نئے زمانے کی نئی طاقتوں اور نئی زندگی سے ہم آہنگ ہو سکے، اس میں نئی پود کے غزل گو شعرا بھی شامل ہیں۔

آج کل انجمن کے افسانہ نگاروں میں موجودہ تحریکات اور عوامی طاقتوں سے متعلق افسانے لکھنے کا رجحان زیادہ ہے، ادھر جو افسانے پڑھے گئے ان میں ابوالفضل صدیقی کا افسانہ "کتے" اور جعفری کا افسانہ "سویرا" خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ دونوں افسانے فسادات سے متعلق ہیں اور ان میں ان اسباب کا بہت گہرا مطالعہ ہے جن کی وجہ سے فرقہ واریت کے جراثیم پھیلتے ہیں۔

جن لوگوں نے نظمیں اور غزلیں پڑھیں ان میں فرید بخش قادری، آفتاب عالم، باقر مہدی، خلیل الرحمٰن اعظمی، سید علی نقوی شہاب جعفری، اور ظہیر الحق خاص طور پر اہم ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

(فروری کے پہلے ہفتے میں علی گڈھ کی انجمن نے ایک کانفرنس بھی کی تھی، جس کی رپورٹ ابھی تک موصول نہیں ہوئی ہے اس لئے شائع نہیں کی جا سکی)

شاخ میرٹھ

میرٹھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ جنوری ۱۹۴۸ء میں قائم کی گئی، جلسے ہر پندرہویں دن ہوتے ہیں شروع شروع میں ممبروں کی تعداد زیادہ تھی، کیونکہ مختلف خیالات کے حضرات شامل ہوئے، اور کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے اصولوں پر اس خیال سے زیادہ زور نہیں دیا گیا، کہ میرٹھ میں ادبی حلقہ بہت محدود ہے اور حاضری کم ہو جائے گی، کچھ دن بعد اس غلطی کا احساس ہوا اور انجمن کے اصولوں کی سختی کے ساتھ پابندی کی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ممبروں کی تعداد تو ضرور کم ہو گئی، لیکن غلط قسم کے لوگ خارج ہو گئے، اور رجعت پرستی سے چھٹکارا مل گیا۔ اور ترقی پسند رجحان زیادہ قوی ہو گیا۔

میرٹھ کی شاخ ہندی اور اردو ادیبوں کی مشترکہ شاخ ہے۔ ہم نے اب تک مرکز سے الحاق نہیں کیا تھا۔ لیکن اب ہم برابر رپورٹیں بھیجتے رہیں گے، اس سال کے پہلے جلسے کی رپورٹ حاضر ہے۔

۱۶ جنوری ۱۹۴۹ء کو انجمن کا جلسہ ہوا جس میں چندر بھوشن آنند پرکاش اور دیو دیال نے مقالے پڑھے اور یحییٰ نے غزل پیش کی۔ اس جلسے میں ایک تجویز بھی اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔

"انجمن ترقی پسند مصنفین میرٹھ کا یہ جلسہ نادر علی بینڈ فیکٹری میرٹھ کے مزدوروں کی ہڑتال پر دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ اپنے جائز مطالبات کے لئے مزدوروں کی یہ لڑائی حق اور انصاف کی لڑائی ہے، یہ جلسہ اس ہڑتال کی مکمل طور پر تائید کرتے ہوئے مالکان اور پولس کے ناروا اور تشدد آمیز طرز عمل کی پر زور مذمت کرتا ہے۔"

سیدہ یحییٰ

شاخ گورکھپور

ابھی تک یہاں کوئی ایسی جماعت نہ تھی، جو ترقی پسند ادب کی تائید اور ترویج میں مدد کرتی، اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے یہاں کے لکھنے والوں نے ایک ادبی جماعت کی تشکیل کی ہے، جس کے اغراض و مقاصد وہی ہیں جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہیں۔ ہماری انجمن کی پہلی نشست ۲۶ دسمبر ۴۸ء کو ہوئی جس میں سال رواں کے عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔ صدر شمیم مظفر پوری اور سکریٹری، ملک زادہ منظور احمد مقرر ہوئے دوسری نشست ۹ جنوری ۴۹ء کو ہوئی جس میں مضامین، افسانے اور نظمیں پڑھی گئیں، ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنی انجمن کا الحاق کل ہند ترقی پسند مصنفین سے کرا لیں۔

ملک زادہ منظور احمد

شاخ فتح گڈھ

مئی ۱۹۴۷ء میں مرکز سے انجمن کے الحاق کے لئے درخواست کی گئی تھی جس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔ نیا ادب کی دوبارہ اشاعت نے حوصلہ افزائی کی اور انجمن کی نئی تنظیم کے سلسلے میں ہندی ادیبوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ ان کے اشتراک سے انجمن کی تشکیل میں کافی مدد ملی۔ یہ طے پایا کہ ہندی اور اردو کے مشترک جلسے مہینے میں دو بار ہوا کریں گے۔ پہلے جلسے کی رپورٹ بھیجی جا رہی ہے۔ ابھی ہمارے ممبروں کی تعداد صرف گیارہ ہے۔

"آزادی" ملنے کے بعد ممبران کی زیادہ تعداد منتشر ہو گئی، اور انجمن پر بھی انتشاری کیفیت طاری ہو گئی، اس کے بعد بنگال کی بے جا گرفتاریوں اور حکومت کی ناجائز پابندیوں سے گھبرا کر ہمارے چند ساتھی "گوشۂ عافیت" کا خواب دیکھنے لگے، اور "زبان بندی" کی تلقین کرتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ اس کس مپرسی کی حالت میں بھی ایک دو حضرات کی مخلصانہ جدوجہد اور گرم جوشی نے انجمن کے وجود کو برقرار رکھتے ہوئے از سر نو تنظیم کی۔ ۹ر جنوری کو انجمن کی نئی تشکیل کے لئے پہلا جلسہ "نیا یوگ" کے ایڈیٹر یوگیندر دت شکلا کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں انجمن کے آئین پر عام بحث ہوئی، اور کچھ ایسی ترمیمیں منظور کی گئیں جن سے اردو اور ہندی کے مشترک جلسوں کے لئے سہولت ہو، غلام ربانی تاباں نے ترقی پسند تحریک پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو ادب کے تاریخی پس منظر اور نئے ادبی رجحانات کا جائزہ لیا۔ یوگیندر دت شکلا اور ٹھاکر بھارت سنگھ نے ہندی ادب میں ترقی پسند تحریک پر مختصر تقریریں کیں۔ کچھ بحث مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ مہینے میں انجمن کے دو مشترک جلسے ہوا کریں گے اور حسب ذیل عہدیداروں کا چناؤ ہوا۔ علیم اعظمی (سکریٹری) ودیا ساگر شکلا (ساتھی سکریٹری)، سید محمد طاہر (خزانچی)

علیم اعظمی

شاخ سمستی پور

یہاں چند نوجوانوں پر مشتمل ایک انجمن "حلقۂ ارباب ذوق" کے نام سے قائم ہے، ہم لوگ کافی بحث و مباحثے کے بعد اس خیال سے بالکل متفق ہو چکے ہیں کہ "سوشلزم کے بغیر انسانی سماج کی نجات ناممکن ہے۔ جنگ، بھوک، اور صدہا بربادیوں سے تباہ ہونے والے انسانوں کو صرف سوشلزم ہی کے ذریعے سے بچایا جا سکتا ہے۔" (لینن) اس لئے ہم اپنی انجمن کو انجمن ترقی پسند مصنفین سے ملحق کر دینا چاہتے ہیں۔

۱۵ر جنوری کو ہمارا جلسہ منعقد ہوا جس میں حسب ذیل انتخابات عمل میں آئے، قیوم قائم (صدر) حساس سمستی پوری (سکریٹری) اور مجلس عاملہ کے پانچ ممبر انتخاب کے بعد شمس سمستی پوری نے ایک نظم سنائی، اور امین حزیں نے ایک مقالہ پڑھا۔ جس میں انھوں نے بتایا کہ سامراج ایک خاص قسم کے معاشی اور سیاسی نظام حکومت کا نام ہے خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، آخر میں حساس شمسی نے دو افسانے سنائے اور جلسہ برخاست اس جلسے نے رسالۂ خیال کے بارے میں انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی کی تجویزوں کی تائید کی۔

حساس سمستی پوری

شاخ پٹنہ

۱۸ر دسمبر ۴۸ء کو انجمن کے جلسے میں ترقی پسند مصنفین کے اعلان نامے پر بحث ہوئی اور اسے غیر مشروط طور سے قبول کر لیا گیا۔ اور پھر نئے سال کے لئے عہدیداروں کا انتخاب ہوا، نوشاد نوری، جنرل سکریٹری، اور یونس رمزی، نائب سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس کے بعد یونس رمزی نے ایک افسانہ سنایا اور صابر آروی نے اپنی نظم سنائی، نظم پر یہ اعتراض ہوا کہ شاعر جذبات پر قابو نہیں پا سکا ہے اور یہ چیخ و پکار آرٹ کی توہین ہے، لیکن نوشاد نوری نے اس سے اختلاف کیا، اور کہا، اظہار مقصد کے لئے شدت احساس کے ساتھ ساتھ شدت

بیان بجائے خود ایک آرٹ ہے، نوشاد نوری نے بھی اپنی ایک نظم سنائی۔ انجمن نے ایک ترقی پسند ماہنامہ نکالنے کی بھی تجویز منظور کی جس کا نام "صبا" ہوگا۔

نوشاد نوری

شاخ گیا

نومبر ۴۸ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے دو جلسے ہوئے جن میں کئی کہانیاں اور نظمیں پڑھی گئیں۔ مخصوص چیزوں کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے، انور عظیم کا افسانہ سلاخوں کے پیچھے بہت پسند کیا گیا، جاوید مشہدی کی نظم "نئی کرن" ترنم اور آہنگ کی کمی کے باوجود قابل توجہ تھی، مسعود ملک کی غزل جاندار خیالات اور بیان کی سادگی کی وجہ سے بہت سراہی گئی، خصوصیت کے ساتھ یہ شعر

ملا ہے اپنی وفاؤں کا یہ صلہ مجھ کو
کہ آج درد سوا ہوگیا ہے سینے کا

بدیع مشہدی نے ایک مقالہ "سامراج" پڑھا۔ جس میں انھوں نے اس مسئلے پر نظری حیثیت سے روشنی ڈالی تھی۔ مقالہ اچھا تھا لیکن سننے والوں کا خیال تھا کہ اس میں بعض خامیاں رہ گئی ہیں۔ جنگ کے بعد سامراجی دنیا میں بہت بڑا بحران آیا ہے اس پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی، مقالہ اچھا تھا۔ اختر پیامی نے اپنی نظم "سالگرہ" سنائی۔ یہ نظم ہندستان کی نام نہاد آزادی کے ایک سال، حکومت کی غیر جمہوری پالیسی اور ترقی پسند طاقتوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی ایک مکمل تاریخ تھی، نظم کی ڈرامائی، فضا نے بہت اثر کیا کاربڈ بھار دواج کی روح جو اس نظم میں ایک کردار کی طرح پیش کی گئی ہے۔ ہمارے سامنے ان لاکھوں کسانوں اور مزدوروں کی علامت بن کے آئی ہے جنھیں ہماری حکومت نے ان کے بنیادی حقوق اور اچھی زندگی سے محروم کر رکھا ہے۔ جاوید مشہدی نے ایک روسی کہانی کا ترجمہ سنایا۔ مسعود ملک نے ایک غزل اور بدر شکیل نے دو قطعات سنائے جن میں سرمایہ و محنت کی کشمکش کو شاعرانہ انداز سے پیش کیا گیا تھا، ضبط کاظمی کی غزل بھی قابل ذکر ہے۔

مسعود ملک

(گیا کی انجمن کے سکریٹری نے اپنا پتہ تحریر نہیں کیا ہے۔ جس کی وجہ سے خط کا جواب نہیں دیا جاسکا۔ نام بھی ٹھیک سے نہیں پڑھا گیا۔ اس لئے ممکن ہے کہ یہاں ان کا نام غلط چھپ رہا ہو)

شاخ جمشید پور

۲۸ نومبر کو انجمن کا جلسہ ہوا جس میں سوویت یونین کو انقلاب کی اکتیسویں سالگرہ پر مبارکباد پیش کی گئی اس کے بعد سہیل صاحب نے انجمن ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ پڑھ کر سنایا جس سے تمام ممبروں نے پورا پورا اتفاق کیا تسنیم صاحب نے ایک افسانہ اور سہیل صاحب نے ایک نظم پڑھی۔ دونوں چیزیں پسند کی گئیں۔ فرحاں واسطی صاحب نے انجمن کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور فنڈ جمع کرنے اور نیا ادب کی اشاعت بڑھانے کی اپیل کی۔

آشنا صدیقی

شاخ رانچی

۲۳ دسمبر ۴۸ء کو انجمن کا جلسہ یہاں کی تحریک میں نئی زندگی پیدا کرنے کے لئے کیا گیا۔ اختر پیامی نے اپنی تقریر میں آج تک کی ترقی پسند تحریک کا جائزہ لیا اور آخر میں کہا کہ اگر ہم آج بھی ترقی پسند مقاصد کے لئے سرگرم عمل ہیں تو ہمیں عزم اور یقین کے ساتھ نئے نظام کے لئے اجتماعی طور پر اپنی طبقاتی، جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے، انھوں نے ان موقع پرست ادیبوں کا پردہ چاک کیا جن کے پاس ابہام، انحطاط، جنس پرستی اور رجعت پسندی کے سوا کچھ نہیں اور آج وہ ہندستان و پاکستان میں اپنی اصلی شکل و صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ ہمیں اس پر افسوس کے بجائے

خوشی کا اظہار کرنا چاہیے کہ ہماری صفیں گندگی سے پاک ہو رہی ہیں۔ اس کے بعد نئے سال کے لئے عہدیداروں کا انتخاب ہوا، سہیل عظیم آبادی صدر اور کلام حیدری سکریٹری منتخب کئے گئے۔

۲۷ جنوری کے جلسے میں ۔ کرشن چندر کا وہ خطبۂ صدارت پڑھا گیا جو انھوں نے احمد آباد کی کانفرنس کے لئے لکھا تھا، اس کا مقصد یہ تھا، کہ ہم آج کے زمانے میں اپنی منزل کا تعین کر سکیں۔ آج دنیا دو حصوں میں بٹ چکی ہے اور ہندستانی فن کاروں کے سامنے صرف دو ہی راستے ہیں ایک طرف سرمایہ داری ہے اور دوسری طرف اشتراکیت ۔ ہمیں دو ٹوک فیصلہ کرنا ہے کہ کون سا راستہ انسانیت کی منزل کی طرف جاتا ہے ۔ ہمارے تمام ممبروں نے کرشن کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ آج ترقی پسند مصنفین جس غیر طبقاتی سماج اور امن و آشتی کا سپنا دیکھ رہے ہیں۔ وہ صرف اشتراکیت کے سرخ پرچم تلے ہی پورا ہو سکے گا۔ ہم ادیب موقع پرست فن کاروں کی طرح غیر جانبدار نہیں رہ سکتے، ہمیں ایسے غداروں کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنی تمام فنی صلاحیتوں کے ساتھ ابھرتی ہوئی انقلابی طاقت کے ساتھ آگے بڑھیں گے، اور سرمایہ داری کے قلعے کو ڈھا کر اشتراکیت کی بنیادیں مضبوط کریں گے۔

اس کے بعد کئی ادبی چیزیں پڑھی گئیں۔ امر نے ایک نظم، عبدالغفار نے ایک افسانہ، انیس تمنائی نے ایک نظم، کلام حیدری نے ایک افسانہ، اختر پیامی نے ایک نظم اور وحید الحسن نے ایک مقالہ پڑھ کر سنایا۔ مقالہ ساحر لدھیانوی کی شاعری پر تھا۔ آخر میں انجمن نے متفقہ طور سے ایک تجویز منظور کی جس میں مغربی بنگال اور یوپی کی حکومتوں کے اس جارحانہ اقدام کی مذمت کی گئی جو انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کے اردو ہفتہ وار نیا زمانہ کے خلاف کیا ہے، انجمن کی رائے میں اس پابندی کا مقصد یہ ہے کہ عوام کے ذہنی تربیت کے راستہ میں چٹانیں کھڑی کر دی جائیں اور انھیں تحریر و تقریر کے بنیادی حق سے محروم کر دیا جائے۔

کلام حیدری

شاخ کلکتہ

۲ جنوری کو انجمن کا پندرہ روزہ اجلاس ہوا۔ عشرت انصاری نے ایک افسانہ، مہدی رضوی نے ایک غزل اور ساجد القادری نے ایک نظم سنائی۔ اس اجلاس کی خاص چیز ضیا عظیم آبادی کا مقالہ اور جیون (ہندی) کے ایڈیٹر شرما جی کی تقریر تھی۔

ضیا عظیم آبادی کا مقالہ عظیم بیگ چغتائی کے فن کے بارے میں تھا۔ پرویز شاہدی نے اس پر تنقید کرتے ہوئے یہ کہا کہ عظیم بیگ کے شعور میں کافی بیداری نہیں آئی تھی۔ انھوں نے کبھی معاشی مسائل پر کچھ نہیں لکھا۔ البتہ معاشرتی نظام پر خوب خوب طنز کیا ہے۔ ضیا نے یہ عذر پیش کیا کہ اس وقت معاشی مسائل اتنی شدومد کے ساتھ سامنے نہیں آئے تھے، یونس احمر نے اس سے اختلاف کیا اور بتایا کہ پریم چند نے عظیم بیگ سے پہلے لکھنا شروع کیا تھا وہ معاشی حالات سے چشم پوشی نہیں کرتے تھے۔

شرما جی نے ہندی ادب کے ترقی پسند اور رجعت پسند فن کاروں پر تقریر کی اور بتایا کہ ہندی کے رجعت پرست ادیب زبان کو زیادہ سے زیادہ مشکل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور موجودہ حکومت ان کی امداد کر رہی ہے۔ لیکن ترقی پسند فن کار رجعت پرست عناصر کو ختم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

یونس احمر

شاخ احمد آباد

۲ جنوری کو یہاں کی انجمن کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا، جس میں سکریٹری نے سالانہ حسابات اور رپورٹ پیش کی۔ احمد آباد کی انجمن نے اس سال جو ترقی کی ہے، وہ قابل تحسین ہے۔ پچھلے سال ہمارے ممبروں کی تعداد پندرہ سولہ تھی اس سال ممبری کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ ہم نے شاعری کو محض شاعری اور افسانے کو محض افسانہ نہیں سمجھا بلکہ روزمرہ کی زندگی سے ان کی آرائش

کی اور ان سے زندگی کی ترجمانی کی۔ سال بھر میں ۴۲ نظمیں اور غزلیں پڑھی گئیں۔ جن میں محمد علوی، تبسم، وحید بنارسی، احمد سمیع، اشعر نوری، جاوید انصاری، قمر نوری، جمیل کلیمی، مہر قاسمی، عزیزہ اور مائل محمود کی چیزیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بیشتر چیزیں سیاسی اور سماجی مسائل کے متعلق تھیں۔ افسانوں میں مظہر الحق علوی، اور محمد علوی کے افسانے اہم ہیں۔ افسانوں کی مجموعی تعداد ۳۱ اور مضامین کی تعداد ۴ ہے۔ بعض اچھے ترجمے بھی پڑھے گئے، اور پروگراموں کے علاوہ بحث کے لئے اہم جلسے ہوئے اس سال کا سب سے بڑا کارنامہ ہماری کانفرنس ہے جو نومبر کے پہلے ہفتے میں منعقد ہوئی۔

اس رپورٹ کے بعد انجمن کے نئے عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔ جس میں محمود مائل سکریٹری، مقرر کئے گئے، آخر میں وارث علی علوی نے سال بھر کے کام پر تنقید کی اور تفصیل سے پورے کام کا جائزہ لیا۔ انھوں نے ان ادیبوں کا ذکر کیا جو دورخی پالیسی پر عمل کر رہے ہیں اور آج کے انقلابی تقاضوں سے آنکھ چرائے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے اس ضرورت پر بھی زور دیا کہ ہر ماہ انجمن کا ایک پروگرام مزدور حلقوں میں ہونا چاہیے۔

احمد آباد کی انجمن نے حیدر آباد کے جواں سال شاعر سلیمان ادیب کی گرفتاری پر سخت احتجاج کیا اور حکومت کے اس فعل کی مذمت کی۔

محمود مائل

نئی کتابیں

۱۔ قلی (ناول) از ڈاکٹر ملک راج آنند — احتشام حسین
۲۔ سیاہ حاشیے (لطیفے از سعادت حسن منٹو) — ممتاز حسین

۱۔ قلی

از:۔ ڈاکٹر ملک راج آنند
ناشر:۔ کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی ۱
قیمت :۔ ساڑھے چھ روپیہ

ملک راج آنند کا یہ ناول اب سے دس گیارہ سال پہلے انگریزی میں لندن سے شائع ہوا تھا، اور بہت جلد اس نے شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اسی ناول نے ڈاکٹر ملک راج آنند کی جگہ انگریزی ادب میں پیدا کی۔ اب اس کا ترجمہ کتب پبلشرز بمبئی نے شائع کیا ہے۔ ترجمہ رضیہ سجاد ظہیر نے کیا ہے جو اور کتابوں کے ترجمے بھی کر چکی ہیں اور خود افسانے اور مضامین لکھتی رہتی ہیں۔ اس ناول کی اشاعت اردو والوں کے لیے سب سے زیادہ اس لیے اہمیت رکھتی ہے کہ اس بڑی سائز کے ۴۶۲ صفحوں پر پھیلی ہوئی کہانی میں پنجاب کے ایک پہاڑی گاؤں کے غریب لڑکے کی تھوڑے دنوں کی زندگی کے انقلاب ہیں اور یہ بات اردو ناول کا موضوع اب تک نہیں بن سکی ہے۔ پریم چند کے علاوہ کسی اور ادیب نے دیہات کے غریب کسانوں کو اپنے ناول کا ہیرو بنانے کی کوشش نہیں کی ہے، حالانکہ اس کی زندگی کے تقاضے ملک کی عام اجتماعی زندگی کے ڈھانچے میں ناول کا موضوع بننے کی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ملک راج آنند کا مشاہدہ، نیز شعور، جاندار اور طرز فکر بیباک ہے انھوں نے ایک چودہ سال کے دیہاتی بچے کی زندگی میں ہندوستان کی سیاسی معاشی، سماجی، مذہبی اور صدیوں کی غلامی میں جکڑی ہوئی طبقاتی زندگی کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے، اور ناول کی خصوصیت کو برقرار رکھتے ہوئے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ناول کا خاکہ بہت پیچیدہ نہیں ہے۔ واقعات سے واقعات پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ منو کا چچا اپنے بھتیجے کی تعلیم چھڑا کر اسے اپنے ساتھ ایک شہر میں لے جا کر ایک بینک کے ملازم کے یہاں نوکر رکھوا دیتا ہے۔ بات سیدھی اور معمولی سی ہے لیکن ملک راج آنند نے اس کے سماجی اور نفسیاتی پس منظر میں طبقوں کی کشمکش، حیات کے نتائج، غلامی کی نفسیات، ہندوستانیوں اور انگریزوں کے تعلقات۔ ذات پات کا فرق، زیادہ اور کم تنخواہ پانے والوں کی ذہنی کیفیت، گھریلو زندگی، چھوٹی تنخواہ پانے والوں کی مری ہوئی روحیں، تمام چیزیں دکھا دی ہیں منو کی زندگی کے پہلے ہی دور میں جو چند مہینوں میں ختم ہو گیا، ناول کا راستہ بن جاتا ہے، ملک راج نے انسان دوستی۔ غریبوں اور مزدوروں کی جھوٹی دوستی بن کر ان کی حقیقت نگاری بے محل انداز نہیں ہوتی، کیونکہ وہ ایک غلام ملک کے بسنے والوں کی بجبور زندگی سے واقف ہیں اور ان کی معاشرت میں جو گھناؤنا پن ہے اسے چھپانا نہیں چاہتے، جب منو اپنے پہاڑی گاؤں میں تھا تو زمیندار کا لڑکا اور چچی اس کے دشمن تھے جب اس کا چچا پہاڑی راستوں پر پیدل گھسیٹتا ہوا اسے شیام نگر لایا تو بھتیجے کو نوکری دلا کر آسودہ حال بنانے کی خواہش نہیں۔ اپنے بنک کے اسسٹنٹ اکاؤنٹ کو خوش کرنے اور منو کی تنخواہ پر قبضہ کرنے کی خواہش زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ جب منو کی مالکہ اسے کوستے کوستے اور مارتے مارتے ادھ موا کر دیتی ہے اور وہ بھوکا پیاسا اپنے چچا کی پناہ میں بھاگ کر آتا ہے تو اس کا چچا الٹا اسی کو مارتا ہے اور اپنے مالک

کے گھر بھگا دیتا ہے جہاں وہ پھر مار کھا جاتا ہے۔ یہاں اس کے چچا یا مالک کی بیوی کے مظالم کا اتنا احساس نہیں ہوتا جتنا ان حالات میں ہونا چاہئے کیونکہ ناول کے سماجی پس منظر میں یہ ظلم جہالت، غریبی اور متوسط طبقہ میں پیدا ہو جانے والی مخصوص قسم کی ذہنیت کا نتیجہ معلوم ہونے لگتا ہے اور ظلم کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔

چودہ سال کا آزاد، خوبصورت، پڑھنے لکھنے کا شائق اور تندرست منو شہر میں پہونچ کر محض کام کرنے، مار کھانے، گالیاں سننے اور ظلم سہنے کی ایک مشین بن جاتا ہے۔ جس سماج میں یہ ممکن ہے وہ سماج ملک راج آنند کے پیش نظر ہے اور منو کی تصویر میں ہندوستان کی تصویر ابھرنے لگتی ہے۔ جب اس میں ظلم سہنے کی طاقت باقی نہیں رہ جاتی تو منو بے ارادہ گھر سے بھاگ نکلتا ہے اور کچھ حیرت اور خوف کے عالم میں ریل کے ڈبے میں گھس جاتا ہے اور اس کی زندگی کا نیا دور شروع ہو جاتا ہے۔ گاڑی میں دو تاجر بیٹھے ہیں جن کا اچار تیل عطر کا کارخانہ ہے۔ ان میں پربھو دیال نیک دل سیدھا سادا پہاڑی ہے جو قلی کا کام کرتے کرتے ایک چالاک عزیز کی شرکت سے کارخانہ دار بن جاتا ہے۔ اس نے اپنا اور اپنی بیوی کا بہت علاج کیا ہے لیکن اس کے بچہ نہیں پیدا ہوا، میاں بیوی دونوں بچے کے ترسے ہوئے ہیں اور جب پربھو دیال کو منو مل جاتا ہے اور اسے اپنے گھر لاتا ہے، تو میاں بیوی اس سے واقعی اسی طرح محبت کرنے لگتے ہیں جیسے ماں باپ کرتے ہیں۔ یہاں پر پربھو دیال کی نفسیاتی کیفیت نے ایک خاص طرح کا کردار پیش کیا ہے۔ جو برداشت کی غیر معمولی کیفیت رکھتا ہے۔ واقعات یوں ہی ایک دوسرے سے مربوط ہوتے چلے جاتے ہیں اور منو خزاں کے مارے ہوئے سوکھے پتے کی طرح حادثات اور واقعات کے تیز جھونکوں میں اڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتا ہے۔ اس کی انفرادیت کو ابھرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا قلی کا کام کرتے کرتے ایک سرکس والے کی دوستی سے فائدہ اٹھا کر۔ وہ ہندوستان کے سب سے اہم شہر بمبئی میں پہونچ جاتا ہے۔ جہاں زندگی کے امکانات کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد کا بمبئی مزدوروں کی بیداری، سرمایہ داری، اور حکومت کے تعاون کا زمانہ تھا۔ ملک راج آنند نے اس سماجی، سیاسی اور انفرادی کشمکش کے دور کی ایسی سچی تصویر پیش کی ہے کہ پڑھنے والے کے دل کے مبہم خیالات اور جذبات اپنی بنیادیں پا جائیں گے، ملک راج آنند کی حقیقت کی حقیقت نگاری میں سادگی کے ساتھ پرکاری اور ظاہری سطحیت کے ساتھ گہرائی اور وسعت ہے، ان کی موضوع سے واقفیت عوام اور خواص کی زندگی کے بارے میں معلومات، نفسیاتی تفصیل کی صلاحیت انھیں اعلیٰ درجہ کا قصہ گو بناتی ہے، ان کے مکالمے برجستہ۔ واقعات کی تفصیل دلکش اور جزئیات نگاری حیرت خیز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ صرف عام پڑھنے والے بلکہ ہمارے اردو کے ناول نگار اسے پڑھ کر اپنے رومانی اور غیر مفید انداز فکر کے آگے نئے راستے دیکھیں گے، ترجمہ اتنا رواں اور خوبصورت ہے کہ کہیں ترجمہ کا دھوکا نہ ہوگا۔

ممتاز حسین

سیاہ حاشئے

منٹو کے سیاہ حاشئے کو مکتب جدید نے شائع کیا ہے

یہ افسانوں کی کتاب نہیں بلکہ لطیفوں، چٹکلوں اور پہیلیوں کی کتاب ہے۔ یہ لطیفے اور چٹکلے فسادکے واقعات سے مرتب کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ حسن عسکری نے لکھا ہے۔

یہ دیباچہ بہت سی ایسی باتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ جن سے شدید اختلاف کے موقع پیدا ہوتے ہیں۔ اگر منٹو کو عسکری کی باتوں سے اتفاق ہے تو سیاہ حاشیے کی نیت بھی معرض خطر میں آ جاتی ہے۔ یہی دشواری مجھے کتاب کے لطیفوں سے تھوڑا سا الگ ہو کر سوچنے پر مجبور کر رہی ہے، اس صورت میں یہ تبصرہ نہ صرف سیاہ حاشئے کا ہوگا بلکہ منٹو کے ذہنی رجحان کا بھی۔

عسکری نے اپنے دیباچے میں جن باتوں پر خاص طور سے زور دیا ہے، انھیں میں نیچے پیش کر رہا ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ پچھلے دس سال میں خارجی حالات سے متاثر ہو کر جتنے افسانے لکھے گئے ہیں ان کا تخلیقی متحرک داخلی جذبہ یا اندرونی لگن نہیں رہی ہے۔ یہ جملہ بہت ہی مبہم ہے لیکن اس کی توضیح میں جو اشارے اور کنائے پیش کیے گئے ہیں ان سے اس کا مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے، ان کا کہنا ہے کہ کرشن چندر کا افسانہ "ان داتا" اور "ہم وحشی ہیں" کے افسانے صرف خارجی حالات اور معاشی تقاضوں کی مصوری کرتے ہیں۔ میں نے کنائے کو نام دے دیا ہے۔ ان افسانوں میں تخلیقی جذبہ نہیں ہے کیونکہ کرشن نے ظالم کو ظالم اور مظلوم کو مظلوم بنایا ہے۔ عسکری کے خیال میں خیر و شر کا یہ امتیاز تخلیقی جذبے کو ختم کر دیتا ہے۔

آپ کو تو یہ معلوم ہی ہے کہ پہلے عسکری ادب برائے ادب کے حامی تھے تو آج کل فسطائی ادب کے حامی ہیں۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ میں یہ بات اسی دیباچے سے ثابت کروں گا۔

عسکری نے ادب برائے ادب کے بارے میں ادبی تخلیق کے مسالے پر بحث کرتے ہوئے یہ بات بتائی ہے کہ ادیب خیر و شر اور ظلم و انصاف کے معاملے میں جانب دار رہتا ہے۔ وہ ظلم کے خارجی اثرات اور معاشی پہلو کو پیش نہیں کرتا ہے، وہ تو صرف ظالم یا مظلوم کے داخلی ردعمل کو پیش کرتا ہے۔ یہ داخلی ردعمل کیا چیز ہے اس بات کو عسکری بھی نہ سمجھا سکے۔ یہ بھی مبہم طریقے سے ایک بات کہہ دینے کا قرینہ ہے۔ خیر جس طرح انھوں نے اس داخلی ردعمل کا اطلاق منٹو کے لطیفوں پر کیا ہے اس سے ان کی بات سمجھ میں آجاتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ "سچ پوچھیے تو منٹو نے ظلم پہ کوئی خاص زور نہیں دیا۔ انھوں نے چند واقعات تو ضرور ہوتے ہوئے دکھائے ہیں مگر یہ کہیں نہیں ظاہر ہونے دیا کہ یہ واقعات یا افعال اچھے ہیں یا برے۔ نہ انھوں نے ظالموں پر لعنت بھیجی ہے نہ مظلوموں پر آنسو بہائے ہیں انھوں نے یہ تک فیصلہ نہیں کیا کہ ظالم لوگ برے ہیں یا مظلوم اچھے ہیں۔" اب داخلی ردعمل کا راز سمجھ میں آگیا۔

ظالم کو اس کی اجازت ہے کہ وہ ظلم کرے اور مظلوم کو اجازت ہے کہ وہ ظلم سہے، ان دونوں چیزوں میں ظلم مشترک ہے جو بذات خود ایک ایسی چیز جس کا تعلق سماجی، سیاسی اور اخلاقی، قدروں سے نہیں ہے، اگر اس کا تعلق ظالم اور مظلوم کی ذات سے ہے تو وہ صرف مشترکہ انسانی فطرت کا تعلق ہے، ظلم کرنے کی فطرت اور ظلم سہنے کی فطرت، اور جب فن کار ظلم کو اس خارجی نقطۂ نظر سے دیکھے گا، تو وہ صحیح ادبی اور تخلیقی جذبے سے کام لے گا۔ یہ ہے ادب کے بارے میں حسن عسکری کا نظریہ، جس کی تفسیر منٹو کے حاشیوں میں پیش کی گئی ہے،

اگر اس چیز کو سمجھنے میں اب بھی کچھ دشواری باقی رہ گئی ہو تو عسکری کے چند جملے اور سنیے: "منٹو نے تو صرف یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ ظالم یا مظلوم کی شخصیت کے مختلف تقاضوں سے ظالمانہ فعل کا کیا تعلق ہے۔ ظلم کرنے کی خواہش کے علاوہ ظالم کے اندر اور کون کون سے میلانات کارفرما ہیں۔ انسانی دماغ میں ظلم کتنی جگہ گھیرتا ہے۔ زندگی کی دوسری دلچسپیاں باقی رہتی ہیں کہ نہیں۔ منٹو نے نہ تو رحم کے جذبات بھڑکائے ہیں، نہ غصے کے، نہ نفرت کے۔ وہ تو آپ کو صرف انسانی دماغ، انسانی کردار اور انسانی شخصیت پر ادبی اور تخلیقی انداز سے غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔"

اب آپ شاید سمجھ گئے ہوں کہ ادبی اور تخلیقی انداز کے کیا معنی ہیں۔ ایک بار وضاحت کے لیے میں پوری بات کو اپنے لفظوں میں پھر دہراتا ہوں، ظالم ایک مخصوص فطرت کے ماتحت ظلم کرتا ہے اور مظلوم ایک خاص فطرت کے ماتحت ظلم سہتا ہے۔ یہ فطرت سماجی، سیاسی اور معاشی حالات اور محرکات سے بے نیاز ہے، اگر آپ نے اس فطرت کا تجزیہ۔ طبقاتی تقسیم، سیاسی اور اقتصادی حالات، مذہبی اور فکری عصبیتوں کی روشنی میں کیا تو ادبی اور تخلیقی جذبہ بالکل ہی نکل بھاگے گا۔ کیونکہ اس وقت آپ چند سماجی اور اخلاقی قدروں کے طرفدار ہو جائیں گے اور

اس وقت آپ ظلم کو انسانی فطرت کی ایک داخلی علامت نہیں بتا سکتے ہیں بلکہ اس کے برعکس ظلم اپنے خارجی مظاہر میں ایک بھوت کی طرح بڑھتا ہوا نظر آئے گا۔ جس کو پہچنوانے کے لئے اس کے چہرے سے نقاب اتارنا ہی پڑے گا۔ یہ کام سستی شہرت حاصل کرنے والے ترقی پسند ادیبوں کا ہے۔ یہ ادب کا ایک طبقاتی نظریہ ہے۔ یہ ادب مظلوموں کا طرفدار ہے۔ عسکری ایسے ادیب کو پروپگنڈسٹ کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ تو ادب برائے ادب کے حامی ہیں۔ وہ تو تمام قدروں کے بارے میں غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں۔ وہ خیر و شر، ظلم و انصاف کی لڑائی میں حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہیں اور انھیں خصوصیتوں کو منٹو کے لطیفوں میں پیش کی ہیں۔ کاش وہ صرف یہیں تک کہتے تو کچھ لوگوں کو بہلا بھی لیتے۔ لیکن یہ کہہ کر وہ فوراً اخلاقی قدروں پر بھی اتر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "منٹو کے یہ افسانے ہمیں اخلاقی طور پر بھی چونکاتے ہیں۔ یہ اخلاقیات کیا ہے اسے بھی انھیں کے لفظوں میں سنئے۔

"منٹو نے انسان کو نہ ظالم بتایا ہے نہ مظلوم بلکہ بس اتنا اشارہ کر کے چپ ہو گیا ہے کہ انسان میں بہت سی باتیں اٹمل اور بے جوڑ ہیں ...... انسانی فطرت کا یہ اٹمل بے جوڑ پن کسی حقیقی رجائیت کی بنیاد بن سکتا ہے"

تو اخلاقی قدروں کے یہ معنی ہوئے کہ جس طرح انسان میں اٹمل اور بے جوڑ عناصر حقیقی رجائیت کی بنیاد ہیں اسی طرح ظالم اور مظلوم کی تقسیم بھی سماجی زندگی میں حقیقی رجائیت کی بنیاد ہے۔ اگر فطرت نہیں بدل سکتی ہے تو پھر ظالم کیونکر بدل سکتا ہے، اس کا اٹمل اور بے جوڑ پن ہی سچائی ہے۔ کیا سرمایہ دارانہ نظام کو قائم رکھنے اور انسان کی بربریت کے   میں اس سے بہتر جملہ لکھا جا سکتا ہے۔ ادب برائے ادب کا یہ پروپگنڈسٹ سیدھے سیدھے فسطائیت کا اقرار کر لیتا ہے۔ اگر یہ بات عسکری ہی تک ہوتی تو ہمیں افسوس نہ تھا، کیونکہ وہ تو اپنی فسطائیت کا اعلان کر چکے ہیں۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ وہ منٹو کو بھی لے ڈوبے۔

ایسا کیوں ہے کہ منٹو نے بغیر کسی احتجاج کے اپنے کو ڈوبنے دیا۔ اب اس کی تاریخ سنئے۔ منٹو کو اپنے افسانوں میں کبھی بھی اس سے سروکار نہ تھا کہ گندگی کے معاشی اسباب کیا ہیں۔ اسے گھناؤنے پہلوؤں سے شدید نفرت بھی رہی ہے لیکن یہ نفرت بالکل داخلی رہی ہے، اس نے حقیقت کے اثرات پر یقیناً غور کیا ہے لیکن کبھی بھی حقیقت کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ گندگی کے ڈھیر کو چیر کر اس حقیقت تک نہیں پہونچا ہے جس نے گندگی کے جمع ہونے میں مدد کی ہے۔ وہ تو گندگی کے ہیبتناک گھور میں یہ ڈھونڈتا رہتا ہے کہ آیا انسان بالکل مر گیا ہے یا کچھ زندہ ہے اور اگر انسانیت کی ایک آدھ جوت بھی نظر آ جاتی ہے تو وہ بڑے فخر کے ساتھ مظاہرہ کرتا ہے۔ دیکھو یہ بات میں نے کتنی مشکل سے ڈھونڈھ نکالی ہے منٹو کے اس کارنامے سے ہمیں انکار نہیں لیکن میں منٹو سے یہ سوال ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ تم اس سے کیا بات ثابت کرنا چاہتے ہو، یہی نہ بتانا چاہتے ہو کہ بدکار سے بدکار انسان میں انسانیت کی ایک آدھ کرن باقی رہ جاتی ہے۔ انسان ایک عجیب و غریب مخلوق ہے۔ اس کا اوپری لباس کچھ ہے تو اندر کچھ بھرا ہوا ہے۔ فرض کر لو یہ باتیں ہماری سمجھ میں آگئیں کہ انسان بیک وقت انسان اور حیوان دونوں ہی ہے وہ انسانیت سے بھاگ کر بھی انسان رہ جاتا ہے تو پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اسے کیا بننا ہے، اگر تمہارے دل میں یہ چھپی ہوئی بات ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ انسان بنے تو تم اس سے انکار نہیں کر سکتے ہو کہ ہمیں نہ صرف اس کے داخلی محرکات بلکہ ان خارجی اسباب کو بھی پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کی مدد سے وہ بہتر انسان بن سکتا ہے، تم کسی صورت سے بھی ادب کے تعلیمی مقصد سے بھاگ نہیں سکتے ہو، میری یہ بات ننگی تصویر کو لباس پہنانے کے مترادف نہیں ہے، اور نہ یہ شور و شر اور ہنگامے کی بات ہی ہے۔ یہ صرف ادب کو سمجھنے کی بات ہے، ادب ہمیں اپنی گندگی سے اوپر ابھارتا ہے۔ اپنے گندے ماحول پر غالب آنے کے لئے اکساتا ہے۔ ہمارے ارادوں میں قوت اور ہماری نگاہ میں مستقبل کی روشنی پیدا کرتا ہے۔ اس کام کے لئے نہ تو ہیرو کو قوت کا انجکشن دینے کی ضرورت ہی اور نہ خود ادیب کو وہسکی کی چسکی لینے کی ضرورت ہے۔

اس قسم کے انجکشن اور چسکی تو سنسنی خیز ادب میں ملتی ہے۔ اور تم اس سے انکار نہیں کر سکتے ہو کہ تمہارے ادب میں اس قسم کی چسکی موجود بھی ہے، پھر بھی میں اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ صحیح، تندرست اور توانا ادب میں یہ قوت موضوع کے انتخاب، اس کے نشو ونما۔ اس کی تعمیر اور تشکیل میں ابھرتی ہے، اور موضوع یہ قوت حقیقت کے نامیہ رجحان سے حاصل کرتا ہے اس کی طاقت زندگی کی طاقت ہے۔ موضوع اسی طاقت کو خود سے جنم دیتا ہے۔ ہمیں ایسے موضوع کو چننا ہوگا جس میں اتنی پہنائی ہو کہ وہ زندگی کی نامیہ طاقت کی غمازی کر سکے، ادب اس قوت سے عاری ہو کر ایک بے جان سی چیز ہو جاتا ہے۔ تمہاری نیت سلامت لیکن تمہاری ادبی کوشش اپنے مقصد میں ناکام ہے۔

منٹو میری باتوں کو نہیں مان سکتا ہے کیونکہ اس کا ادبی نظریہ اس کی انفرادیت پرستی اور سنسنی خیز افتادِ طبع کے تابع ہے، وہ ادب کو سائنسی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھنا چاہتا ہے۔ پھر بھی وہ بہت دور تک ہمارے ساتھ چلنے پر رضامند تھا، کیونکہ اسے ظالم سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اسے گرے پڑے انسانوں کے کردار سے ہمدردی تھی، اسے انسانوں کے کمینہ پن سے نفرت تھی، اسے سماج کے تمام گھنونے مظاہر سے نفرت تھی۔ اس وقت وہ اپنے اصلی دشمن کو بھی پہچانتا تھا۔ جس کے سینے میں وہ اپنے پستول کی تمام گولیاں خالی کر دینا چاہتا تھا۔

ان دونوں چیزوں نے اسے ساتھ چلنے کے لئے مجبور کر رکھا تھا، اور باوجود اس بات کے کہ اس نے ادب جدید، ترقی پسند ادب، فحش ادب سب کو گڈمڈ کر دیا تھا۔ پھر بھی ترقی پسند ادب کے خلاف ایک جملہ بھی نہیں کہا۔ اور نہ اب تک کوئی بھی ایسی بات کہی ہے لیکن آج اپنے کو عسکری کے ساتھ بریکٹ کر کے ہمیں اس کا موقع دیا وہ کہ ہم اس کے بھٹک جانے والے رجحان کا جائزہ لے سکیں، راہ میں چلتے چلتے دشمن کی طرف مڑ کر دیکھنا اور دشمن کو دوست بنانا اس بنیادی رجحان کی غمازی کرتا ہے جو اسے ترقی پسندی کو بھرپور طور سے قبول کرنے میں مانع تھی۔

منٹو نے عسکری کا دیباچہ پسند کیوں کیا؟ یہ بھی سوچنے کی بات ہے۔ آپ شاید یہ سمجھیں کہ میں دیباچے کو زیادہ اہمیت دے رہا ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ "سیاہ حاشیوں" کا رجحان اس کی پچھلی تصنیفات کے رجحان سے مختلف ہے، پہلے منٹو کی نظر گندگی کے بارے میں اس قدر غیر جانبدارانہ نہ تھی کہ اس نے ظالم کو ظالم نہ کہا ہو یا اس کا سینہ دکھ درد کے بارے میں دھڑکا بھی نہ ہو۔

آج وہی نظر حاشیوں میں اس قدر غیر جانبدار ہے کہ وہ ظالم اور مظلوم میں فرق بھی نہیں کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس کے ذہن میں تلخیاں بھی ہیں اور اس کے زہر خند میں خود فراموشی کا احساس بھی، پھر بھی وہ بالکل شعوری طور سے ظالم اور مظلوم کے درمیان فرق کرنا نہیں چاہتا۔ منٹو کی یہ کوشش نہ صرف ہمارے مطمع نظر کو ڈھونڈتی ہے بلکہ ظالموں کے پروپگنڈے کو تقویت بھی پہونچاتی ہے۔ اس نے ایک لاٹھی سے مزدور، سرمایہ دار اور عام انسانوں کو ہانکا ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس فساد میں سب شامل تھے، اس کی ذمہ داری کسی کے سر پر عائد نہیں ہوتی ہے یہ انسان کی جبلت کا مظاہرہ تھا۔ یہ کس قدر جھوٹ ہے، اس دور کے فسادنے تو اپنے سیاسی مذہبی اور معاشی رشتوں کو اس بری طرح بے نقاب کیا ہے کہ اسے جبلت کا مظاہرہ بتانا تصویر کے چہرے پر پردہ ڈالنے کے برابر ہے۔

اب میں منٹو کو ایک جملے کی یاد دہانی کرانا چاہتا ہوں۔ یہ جملہ منٹو کی اس تقریر کا ہے جو انھوں نے جوگیشوری کالج بمبئی میں کی تھی، اور جو شائع ہو چکی ہے۔

"میں تہذیب اور تمدن کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی، میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا اس لئے کہ یہ میرا کام نہیں، درزیوں کا کام ہے۔"

منٹو نے فساد کی ننگی تصویر کو وہی لباس پہنایا ہے جو ہمارے حکمراں پہنانا چاہتے ہیں۔ ان حکمرانوں کا یہ کہنا ہے کہ فساد

کا تعلق ہندستان کے سرمایہ دار، جاگیردار، دیش بھگت اور سامراجی ایجنٹوں سے نہ تھا، یہ ہندوستانی اقوام کی بربریت ان کی نا ملائم جبلت اور قدیم عصبیتوں کا نتیجہ ہے وہ کپڑا جو ہمارے حکمراں فساد کی لاش پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ منٹو نے ایک چابکدست درزی کی طرح اس کپڑے کو کتر بیونت کرکے ایک خوبصورت لباس میں پیش کیا ہے۔ اگر منٹو کے اس فن کی داد نہ دی جائے تو اس کے پیشے کی توہین ہوگی۔

منٹو درزی کیوں بن گیا۔ اب آپ خود سوچئے۔ منٹو کس کا درزی ہے، یہ بھی سوچنے کی بات ہے۔

آخرِ شب

از

کیفی اعظمی

کیفی اُردو شاعری کا "سُرخ پھول" ہے اور "آخرِ شب" اُس کی تازہ ترین نظموں کا مہکتا ہوا گلدستہ۔ کیفی کی انقلابی نظمیں ہندستان کے کونے کونے میں مشہور ہیں۔ اُس کے ترانے شہر میں، دیہات میں، گلی میں، بازار میں ہر جگہ گونجے ہیں۔ اُس کے ہر ہر شعر میں مزدور اور کِسان کا دل دھڑکتا ہے۔

آخرِ شب

میں کیفی نے ڈھلتی ہوئی رات کا کرب اور طلوع ہوتی ہوئی صبح کا نشاط بھر دیا ہے۔ یہ مجموعہ ترقّی پسند شاعری کے جلال و جمال کا آئینہ ہے۔

آخرِ شب

صبحِ نَو کا پیش خیمہ ہے۔ صبحِ نَو جس کے لئے ہندستان کا ذرّہ ذرّہ بیتاب اور مشتاق ہے۔ جس کے حُسن میں مُلک اور قوم کے شہیدوں کا خون صَرف ہوا ہے۔ صبحِ نَو جو اپنے سُرخ پرچم اُڑاتی ہوئی آرہی ہے۔ اُس کی جھلک "آخرِ شب" میں نظر آتی ہے۔

سائز ۱۸×۲۲/۸ صفحات ۱۵۰، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش، قیمت تین روپیہ

زعفران کے پھول

از

خواجہ احمد عباس

جب بہت سے افسانہ نگار زندگی کے گرد منڈلا رہے تھے عین
اسی وقت عباس خاموشی سے اٹھا اور ٹھوس حقیقتوں پر ٹوٹ پڑا۔ کسی نے
کہا وہ اخبار نویس ہے، کسی نے کہا ڈھنڈورچی ہے، زندگی نے کہا میرا
نباض ہے۔ "زعفران کے پھول" عباس کی تین طویل کہانیوں کا مجموعہ
ہے، اس میں اُس کا فن اپنے پورے شباب پر ہے۔ اِس مجموعے کی تینوں
کہانیاں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مضبوط جلد، خوبصورت گردپوش، قیمت اڑھائی روپیہ

کتب پبلشرز لمیٹڈ۔ بمبئی